مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول
(مولانا) مشرف علی تھانوی

مدیر
ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۱۸ | ربیع الثانی ۱۴۳۸ھ | جنوری ۲۰۱۷ء | شمارہ ۱

فناء النفوس

رضائے الٰہی کے لئے نفس کشی

ازافادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/ ۲۰ روپے
زرسالانہ =/ ۲۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور
۳۵۴۲۲۲۱۳
۳۵۴۲۳۰۴۹

پتہ دفتر
جامعۃ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) مشرف علی تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۲۰/۱۳ اریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور
مقام اشاعت
جامعۃ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

فناء النفوس

رضائے الٰہی کے لئے نفس کشی

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	قوت تکرار	۹
۲	تعیین مضمون	۱۰
۳	نظر فی السباق	۱۰
۴	اعتبار عموم الفاظ	۱۴
۵	لسانی کا طبعی اثر	۱۶
۶	آثارِ طبعیہ	۱۸
۷	من گھڑت حکایت	۱۸
۸	مجاہدہ اور لوازم بشریت	۲۰
۹	ذکر قلبی اور اختلاج میں فرق	۲۱
۱۰	بکاء بالقلب	۲۲
۱۱	امتیاز انسانیت	۲۴
۱۲	دین کے اعتبار سے لوگوں کی اقسام	۲۵

۱۳	انسانوں کی اقسام	۲۸
۱۴	تفسیر آیت	۲۹
۱۵	بیان طریق استنباط	۳۰
۱۶	ایک تفسیر	۳۱
۱۷	طلب کا اعلیٰ درجہ	۳۲
۱۸	صاحبِ حال لوگ	۳۲
۱۹	اقسام طلب	۳۴
۲۰	مقامِ کمال	۳۶
۲۱	قیاسِ فاسد	۳۸
۲۲	منتہی کی حالت	۳۹
۲۳	شانِ نزول	۴۱
۲۴	حقیقت نفس	۴۲
۲۵	حقوق وحظوظ	۴۵
۲۶	جمعیت قلب	۴۶
۲۷	محبت منعم	۴۷
۲۸	اخفاء کاملین	۴۹

۲۹	حکایت	۵۰
۳۰	عکس نعمائے جنت	۵۱
۳۱	لطیفہ	۵۲
۳۲	نمونہ	۵۲
۳۳	ترک لذائذ	۵۳
۳۴	اطلاع واتباع	۵۴
۳۵	قطع وساوس	۵۵
۳۶	وساوس سے بچنے کی تدبیر	۵۷
۳۷	تصور شیخ	۵۷
۳۸	طریق اصلاح کا حاصل	۵۹
۳۹	نگاہِ قلب کی حالت	۶۰
۴۰	حقیقت عشق	۶۱
۴۱	اشکال کا جواب	۶۱
۴۲	مذاق العارفین	۶۲
۴۳	اعضاء کی قدر	۶۳
۴۴	کلامِ حق برزبانِ سالک	۶۴

۴۵	غیر حق نہ ہونے کا معنی	۶۵
۴۶	شراء نفس	۶۶
۴۷	ملک الموت کا نام اور اسکی وجہ	۶۷
۴۸	اشکال کا جواب	۶۸
۴۹	تفصیل تفویض	۶۹
۵۰	احضارِ قلب	۷۰
۵۱	عبدِ کامل	۷۳
۵۲	طلب رضاء	۷۶
۵۳	طلب مطلوب سے وصول مطلوب نہیں	۷۷
۵۴	آب محبت	۷۸
۵۵	وعدۂ رضاء	۸۰
۵۶	ثمرۂ تفویض	۸۱

وعظ

فناء النفوس

رضائے الٰہی کے لئے نفس کشی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فناء النفوس سے موسوم وعظ بوقت صبح بروز جمعرات ۸ محرم الحرام ۱۳۴۴ھ کو بعض مہمانوں کی درخواست پر کرسی پر بیٹھ کر حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً پچاس تھی۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نور اللہ مرقدہٗ نے قلمبند فرمایا۔

خلیل احمد تھانوی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارک وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ﴾(۱)

قوت تکرار

اس وقت بیان کرنے کی کوئی خاص ضرورت داعی(۲) نہیں محض چند مہمانوں کی رغبت(۳) معلوم ہوئی۔ان کوخوش کرنے اور ان کونفع پہنچانے کے لئے (اور یہی اُن کا خوش کرنا بھی ہے) اس وقت بیان اختیار کیا گیا ہے بیان کے لئے کسی خاص نئے مضمون کا جوش اور داعیہ قلب (۴)میں پیدا ہوتا ہے مگر اس وقت یہ بات نہیں ہے اس لئے شاید مضامین وہی ہوں جو اکثر سنے ہیں۔لیکن تکرار کی وجہ سے وہ

(۱)'' اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک صرف کرڈالتا ہے اور اللہ تعالیٰ (ایسے) بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہیں'' البقرۃ: ۲۰۷ (۲) کوئی خاص ضرورت پیش نہیں آتی (۳) شوق معلوم ہوا (۴) بیان کے لئے کسی نئے مضمون کے دل میں آنے اور اس کو بیان کرنے کا تقاضہ پیدا ہوتا ہے مگر اس وقت ایسی بات نہیں ہے۔

فضول و بیکار نہ سمجھے جائیں۔ کیونکہ تکرار سے تائید وقوت تو ضرور ہوجاتی ہے اور یہ بھی ایک جدید نفع ہے(۱) دوسرے مضامین مکررہ سبب ہوجاتے ہیں مضامین جدیدہ غیر مکررہ کے لئے۔ یعنی مضامین مکررہ کے بیان کرتے ہوئے جدید مضامین بھی اکثر بیان ہوجاتے ہیں۔ اس لئے تکرار کو بے رغبتی کا سبب نہ بنایا جائے خواہ سب مضامین مکرر ہوں یا بعض غیر مکرر ہوں (۲) یہ خلاصہ ہے اس وقت کے مضمون کے اختیار کرنے کا۔

تعیین مضمون

میں نے جس آیت کی تلاوت کی ہے اس کے ترجمہ سے مضمون کی تعیین ہوجائے گی اور تفسیر سے اس کی تفصیل ہوجائے گی۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ بعض لوگ وہ ہیں جو اپنے نفسوں کو بذل کردیتے ہیں (۳)۔ یعنی خرچ کردیتے ہیں اللہ کی مرضی طلب کرنے کے لئے اور اللہ تعالیٰ بندوں پر بہت مہربان ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ اس جگہ ایک عمل کی فضیلت مذکور ہے۔ یعنی ''شراء نفس'' کی اور ایک اس کی غایت مذکور ہے یعنی ''ابتغاء مرضاۃ اللہ'' اور گو غایت بھی ایک فعل ہی ہے مگر اس میں جہت مقصودیت غالب ہے اس لئے بہ نسبت عمل کہنے کے اس کو غایت کہنا زیادہ زیبا ہے اور ایک ثمرہ مذکورہ ہے ''وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَاد ''(اور اللہ تعالیٰ بندوں پر بہت مہربان ہیں) کہ اس فعل اور غایت کا ثمرہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت اور راحت متوجہ ہوتی ہے یہ تین مضمون اس آیت میں مذکور ہیں۔

نظر فی السباق

اور اُس کی تفسیر میں سیاق وسباق (۴) پر نظر کر کے مفسرین نے اس کی دو

---

(۱) نیا فائدہ (۲) چاہے سب مضامین ایسے ہوں جو پہلے بیان ہوچکے ہوں یا کچھ ان میں ایسے بھی ہو جو پہلے بیان نہ ہوئے ہوں (۳) خرچ کردیتے ہیں (۴) اس سے پہلے اور بعد کی آیات میں غور کر کے مفسرین نے دو توجیہیں کی۔

توجیہیں بیان کی ہیں۔ بعض نے ایک توجیہ بیان کی ہے اور بعض نے دوسری توجیہ بیان کی ہی اس میں بھی سیاق وسباق پر نظر ہے مگر دور تک نہیں۔ انہوں نے صرف قریب کی آیت پر نظر کی ہے سیاق کا لفظ ویسے ہی زبان سے نکل گیا۔ مقصود صرف سباق ہے کیونکہ ان توجیہات میں سباق ہی کو دخل ہے اور سباق پر نظر کرنا بھی تفسیر کا بڑا جزو ہے خصوصاً ربط سمجھنے کے لئے اس کی بہت ضرورت ہے۔ (۱) ورنہ بعض اشکالات واقع ہونے لگتے ہیں۔ اس کی نظیر میں (۲) ایک آیت اس وقت یاد آئی ہے جس میں سباق پر نظر نہ کرنے سے اشکال واقع ہوا ہے۔ آیت یہ ہے کہ ’’ وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِیْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلاً ‘‘ یعنی حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے۔ اگر اسی آیت کے الفاظ پر نظر کو مقصود کر دیا جائے تو اس پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ تو خلاف مشاہدہ ہے ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ کفار کو مسلمانوں پر غلبہ ہو گیا ہے اس کا جواب بھی دیا گیا ہے اور اچھا جواب ہے کہ غلبہ سے غلبہ فی الحجت مراد ہے (۳)۔ مطلب یہ ہوا کہ حجت میں کافروں کو کبھی غلبہ نہ ہوگا اور یہ مشاہدہ کے موافق ہے (۴)۔ حجت میں ہمیشہ اسلام ہی کو غلبہ ہوا ہے اور ہوتا ہے گو یہ جواب فی نفسہٖ صحیح ہے مگر کیا اچھا ہو کہ اشکال ہی نہ پڑے جو جواب دینے کی ضرورت ہو تو سباق میں نظر کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں اوپر سے فیصلہ قیامت کا ذکر ہے اور یہ جملہ اُسی فیصلہ کے متعلق ہے پوری آیت یوں ہے۔

’’ فَاللّٰهُ یَحْكُمُ بَیْنَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ط وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِیْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلاً ‘‘ یعنی پس اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان فیصلہ کریں گے قیامت کے دن اور (اس فیصلہ میں) حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے۔ دیکھئے سباق میں نظر کرنے سے یہ فائدہ ہوا کہ اشکال وارد ہی نہیں ہوتا کیونکہ یہاں غلبہ فی الدین کا ذکر ہی نہیں بلکہ فیصلہ قیامت میں غلبہ نہ ہونے کا ذکر ہے۔ علماء کو یاد کر لینا چاہئے کہ

(۱) آیات میں باہم کیا ربط ہے بات سمجھنے کیلئے (۲) مثال کے طور پر (۳) دلیل میں غلبہ (۴) یہ بات سب پر عیاں ہے۔

تفسیر آیت کے وقت صرف آیت کے اُسی ٹکڑے کو نہ دیکھیں جس کی تفسیر مقصود ہے بلکہ اوپر سے ملا کر دیکھیں انشاء اللہ اس طرح اول تو اشکال ہی وارد نہ ہوگا اگر ہوا بھی تو جواب بھی اسی موقع پر مل جائے گا۔

دوسری نظیر(۱) ایک اور یاد آئی کہ وہاں بھی سباق پر نظر نہ کرنے سے اشکال واقع ہوا ہے۔

آیت یہ ہے: ﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾(۲)

اس آیت کے الفاظ پر نظر کر کے بعض اہل باطل نے استدلال کیا ہے کہ ارسال رسل کا باب منقطع نہیں ہوا(۳) کیونکہ اس آیت میں حق تعالیٰ جملہ بنی آدم کو جن میں امت محمدیہ بھی داخل ہے، خطاب فرما رہے ہیں کہ اگر تمہارے پاس رسول آئیں الخ۔ اگر باب رسالت مسدود ہو چکا ہے(۴) تو اب اس قسم کے خطاب کے کیا معنی ہوئے (۵) یہ اشکال اس لئے ہوا کہ ان لوگوں نے محض اسی آیت کے الفاظ کو دیکھا اگر سباق پر نظر کی جائے تو پھر قصہ سہل ہو جاتا ہے(۶) وہ یہ کہ اوپر سے آیات میں نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سے اوپر آدم علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے کہ وہ پیدا کئے گئے پھر جنت میں رکھے گئے پھر وہاں سے زمین پر اُتارے گئے۔ اور اس وقت آدم علیہ السلام کو اور ان کی ذریت(۷) کو کچھ خطابات ہوئے ہیں چنانچہ: ﴿قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ

(۱) یہ نظیر مع تقریر اشکال و جواب کے غیر مکرر ہے احقر نے اب تک کسی وعظ میں اس آیت کے اشکال و جواب کی تقریر نہیں سنی (۲) ''اے اولاد آدم اگر تمہارے پاس تمہارے میں سے کچھ رسول آئیں جو میری آیتیں تمہارے سامنے پڑھیں تو پھر جو شخص (اُن کے حکم کے موافق) تقویٰ اختیار کرے اور (اعمال کی) اصلاح کرے گا اُن پر کچھ اندیشہ نہ ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے'' سورۃ الاعراف:۳۵ (۳) رسولوں کو بھیجنے کا سلسلہ ختم نہیں ہوا (۴) اگر رسول بھیجنے کا سلسلہ بند ہو چکا ہے (۵) اس خطاب کا کیا مطلب ہے (۶) قصہ آسان ہو جائے گا (۷) اولاد۔

مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ۝ قَالَ فِیْهَا تَحْیَوْنَ وَ فِیْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ۝﴾(۱) میں آدم علیہ السلام وذریت آدم دونوں کو خطاب ہے(۲) پھر﴿ یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِیْشًا﴾ ''اے اولاد آدم علیہ السلام ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا جو تمہارے پردہ اور بدن کو بھی چھپاتا ہے اور موجب زینت بھی ہے اور تقویٰ کا لباس اس سے بڑھ کر ہے'' اور ﴿یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّكُمُ الشَّیْطٰنُ كَمَاۤ اَخْرَجَ اَبَوَیْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ یَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِیُرِیَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا﴾(۳) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسی حالت میں جاؤ کہ تم باہم بعض دوسرے کے دشمن رہو گے اور تمہارے واسطے زمین میں رہنے کی جگہ ہے اور نفع حاصل کرنا ایک وقت تک اور فرمایا تم نے وہاں زندگی بسر کرنا اور اور وہاں مرنا پیدا ہونا ہے۔

میں اسی وقت اولاد آدم علیہ السلام کو خطاب ہوا ہے اُسی وقت کے خطاب کا یہ بھی تتمہ ہے(۴) ''یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ '' الآیۃ:۔ پس یہ سب خطابات قصہ ہبوط آدم علیہ السلام کے وقت یا اُس کے متصل ہی(۵) ارواح بنی آدم کو ہوئے جن کو اس وقت اس لئے نقل کردیا گیا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ یہ عہود دہم سے قدیم(۶) زمانہ میں لے لئے گئے ہیں کوئی نئی بات نہیں اور اُس وقت باب رسالت بند نہ تھا۔(۷) لہذا اب کوئی اشکال نہیں (اور اس خطاب کے قدیم ہونے کی تائید آثار سے بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ''بیان القرآن'' میں بروایت ابن جریر

(۱) ''حق تعالیٰ نے فرمایا کہ نیچے ایسی حالت میں جاؤ کہ تم باہم بعضے دوسرے بعضوں کے دشمن رہو گے اور تمہارے واسطے زمین میں رہنے کی جگہ ہے اور نفع حاصل کرنا ایک وقت تک، فرمایا کہ تم کو وہاں ہی زندگی بسر کرنا ہے اور وہاں ہی مرنا ہے اور اسی میں سے پھر پیدا ہونا ہے'' (۲) آدم علیہ السلام اور اولاد آدم دونوں کو خطاب ہے(۳) ''اے اولاد آدم علیہ السلام شیطان تم کو کسی خرابی میں نہ ڈال دے جس نے تمہارے دادا اور دادی کو جنت سے باہر کرادیا کہ ان کا لباس بھی ان سے اتار دیا اور پردہ کا بدن دکھائی دینے لگا'' سورۃ الاعراف:۲۴-۲۵ (۴) تکملہ ہے (۵) آدم علیہ السلام کے نزول دنیا کے موقع پر یہ سب خطابات ہوئے (۶) یہ سب عہد گذشتہ زمانے میں لئے گئے (۷) اور اس وقت کیونکہ انبیاء کو بھیجنے کا سلسلہ بند نہیں تھا اس لئے آیت کے مضمون پر کوئی اشکال نہیں۔

ابو سیار سلمی کا قول نقل کیا گیا ہے) دوسرے ''القرآن یفسّر بعضُہ بعضا ''(قرآن حکیم کے بعض حصے بعض کی تعریف کرتے ہیں) کے قاعدہ سے سورہ بقرہ کی آیت بھی اس کی موید ہے کیونکہ وہاں ارسال رسل کا مضمون حکم ہبوط کے ساتھ متصل ہی بیان ہوا ہے۔ فرماتے ہیں: ﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾(۱)

اس خطاب میں بجز اس وقت کا خطاب ہونے کے اور کوئی احتمال ہو ہی نہیں سکتا۔ پس ایسے ہی یہاں بھی یہ خطاب ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ﴾ الخ ''قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ'' سے مربوط ہے۔ گو بیچ میں اور مضامین بھی آ گئے ہیں اس کا کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ بات میں سے بات نکل ہی آیا کرتی ہے۔ بلاغت کا مسئلہ ہے۔ ''الکلام یَجُرُّ بَعْضَهٗ بَعْضًا''(۲) چنانچہ بلغاء کا قاعدہ ہے کہ ایک بات کو شروع کرتے ہیں، اُس سے دوسری بات نکل آئی تو تبعًا اس کو بھی بیان کر دیا، اس کے بعد پھر پہلی بات کی طرف عود کرتے ہیں(۳)۔ قرآن کا نزول اسی طرز محاورہ پر ہوا ہے۔ معقولیین (۴) یا مصنفین کے طرز پر نہیں ہوا۔ لہٰذا یہاں ربط سمجھنے اور تفسیر دریافت کرنے کے لئے دور تک آیات کو دیکھنے کی ضرورت ہے لطف تفسیر کا اسی میں ہے اور اس سے سب اشکالات حل ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی یہاں بھی سباق میں نظر کر کے آیت کی تفسیر کرنا چاہئے۔ گو یہاں سباق میں نظر نہ کرنے سے کوئی اشکال تو واقع نہ ہوگا۔ مگر لطف بھی حاصل نہ ہوگا۔ اس لئے مفسرین نے سباق پر نظر کر کے اس کی دو توجیہیں کی ہیں۔

اعتبار عموم الفاظ

بعض نے تو سباق قریب پر نظر کی ہے اور وہ یہ ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ

(۱) ''ہم نے حکم فرمایا نیچے جاؤ اس بہشت سے سب کے سب پھر آوے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت سو جو شخص پیروی کرے گا میری اس ہدایت کی تو نہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے'' البقرۃ: ۳۸ (۲) بات سے بات نکل آتی ہے (۳) پہلی بات کی طرف لوٹ جاتے ہیں (۴) منطقی یا تصنیف کے انداز میں نہیں ہوا۔

يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِي قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾(۱)

اس پر نظر کر کے تو تفسیر آیت کی یہ ہوئی کہ حق تعالیٰ نے یہاں تقسیم کی ہے کہ لوگوں کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو معجب بالحیوۃ الدنیا ہے(۲) دوسرے وہ جو حیاتِ دنیا کو ابتغاء رضاء الٰہی میں بیع کر چکا ہے۔ اس کا بیان ''وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ'' الخ میں ہے اور اس پر سب مفسرین کا اتفاق ہے کہ ''وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ'' الخ۔ یہ آیت مع اپنے توابع کے ایک منافق کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس کا نام غالباً اخنس تھا۔ گو حکم مذکور میں اس کی تخصیص نہیں بلکہ جو بھی ویسا ہو اُس کا وہی حکم ہے جو یہاں بیان ہوا ہے۔

جو لوگ اس طرح سے نفس کے لئے بہانہ ڈھونڈتے ہیں(۳) وہ تخصیص شان نزول سے بے فکر ہو جاتے ہیں(۴) کہ جہاں کسی فعل شنیع پر وعید نظر آئی(۵) انہوں نے فوراً کہہ دیا کہ یہ تو فلاں شخص یا فلاں جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے ہم سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔ مگر خدا جزائے خیر دے۔ اصولیین کو کہ انہوں نے قاعدہ مقرر کر دیا ہے۔

''العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص السبب'' کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہے۔ خصوص سبب نزول کا اعتبار نہیں، پس جہاں کسی فعل پر کوئی وعید عموم الفاظ کے ساتھ وارد ہوگی یا کوئی حکم مرتب ہوگا۔ اس کو عام ہی کہا جائے گا۔ مورد(۶) کے ساتھ خاص نہ کیا جائے گا ورنہ چاہیئے کہ لعان(۷) کا حکم حضور ﷺ کے بعد نہ ہوتا۔

---

(۱) ''اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اُس کی گفتگو جو محض دنیوی غرض سے ہوتی ہے مزہ دار معلوم ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو حاضر ناضر بتاتا ہے اپنے مافی الضمیر پر حالانکہ وہ مخالفت میں شدید ہے'' سورۃ البقرۃ: ۲۰۴
(۲) دنیاوی زندگی میں مست (۳) نفس کی سہولت کے لئے بہانے ڈھونڈتے ہیں (۴) کسی خاص واقعہ میں آیت کے نازل ہونے کی بنا پر بے فکر ہو جاتے ہیں (۵) کسی برے فعل پر وعید نظر آئی تو فوراً کہدیا (۶) جس موقع پر یہ حکم نازل ہوا ہے اس کے ساتھ خاص نہیں ہوگا (۷) اگر شوہر بیوی پر زنا کی تہمت لگائے تو دونوں سے قسمیں لی جاتی ہیں اس کو لعان کہتے ہیں۔

کیونکہ اس کا نزول ایک خاص واقعہ میں ہوا ہے مگر خود حضور ﷺ نے بھی اس واقعہ کے بعد دوسرے واقعہ میں اس حکم کو جاری کیا ہے اور خلفاء نے بھی ہمیشہ اس کو جاری رکھا ہے۔ اسی طرح یہاں رکھا جائے گا کہ گو نزول آیت کا ایک خاص منافق کے باب میں ہے مگر حکم اسی کے ساتھ خاص نہیں۔ شانِ نزول صرف محرک نزول (۱) ہوجاتا ہے مقصود اصلی وہی نہیں ہوتا۔

لسانی کا طبعی اثر

غرض وہ منافق وہ بڑا لسان تھا (۲) ایسا کہ کبھی کبھی حضور ﷺ پر بھی طبعاً اس کی لسانی (۳) کا اثر ہوجاتا تھا۔

اسی لئے تو ''یُعْجِبُكَ قَوْلُہ'' (۴) حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ باوجود یہ کہ حضور ﷺ ایسے عاقل تھے کہ میں آپ کے عاقل ہونے پر ایک لطیفہ بیان کیا کرتا ہوں وہ یہ کہ مسلمان تو آپ کو عاقل مانتے ہی ہیں وہ تو غلام ہیں اپنے آقا کو اچھا کہیں ہی گے اور جتنا کچھ کہیں تھوڑا ہے۔ مگر لطیفہ یہ ہے کہ کفار مسلمانوں سے زیادہ آپ کو عاقل مانتے ہیں کیونکہ اس کا اقرار کفار کو بھی ہے کہ حضور ﷺ نے تھوڑی سی مدت میں اتنے بڑے بڑے کام کیے ہیں جو دوسرا نہیں کرسکتا۔ عرب کے جاہلوں کو تھوڑے ہی دنوں میں ایسا شائستہ اور مہذب بنادیا کہ تمام تعلیم یافتہ قومیں اُن کے سامنے پست ہوگئیں پھر اس کے ساتھ قواعد متعلقہ معاش ومعاد ایسے ممہد (۵) کیے جن کی نظیر نہیں مل سکتی یہ سب باتیں کفار کو تسلیم ہیں مگر ہم تو حضور ﷺ کو محض سلطان نہیں کہتے بلکہ نبی بھی کہتے ہیں اور ان فیوض وبرکات کو تائید من اللہ اور نبوت کی

(۱) واقعہ نزول صرف اس کا سبب ہوجاتا ہے مقصود نہیں ہوتا (۲) باتونی (۳) اس کی چرب زبانی (۴) ''اس کی گفتگو مزہ دار معلوم ہوتی ہے'' البقرۃ: ۲۰۴ (۵) دنیا وآخرت کے لئے ایسے قواعد مقرر فرمائے۔

برکت سمجھتے ہیں اور کفار حضور ﷺ کو نبی نہیں مانتے وہ حضور ﷺ کے ان سب کارناموں کو آپ ﷺ کی عقل سے ناشی سمجھتے ہیں (۱) اور کہتے ہیں کہ محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) بہت بڑے عاقل انسان تھے کہ تھوڑی سی مدت میں آپ نے ایسے ایسے کام انجام دیئے تو وہ آپ کو ہم سے زیادہ عاقل مانتے ہیں کہ جو کام ہمارے نزدیک خدا کے کرنے کا تھا۔ اُن کے نزدیک وہ حضور ﷺ کی عقل کا نتیجہ ہے۔ غرض حضور ﷺ ایسے عاقل تھے کہ موافق و مخالف سب کو آپ کا عاقل کامل ہونا مسلم ہے مگر وہ منافق ایسا لسان تھا (۲) کہ حضور ﷺ جیسے عاقل پر بھی اس کی لسانی (۳) کا طبعاً اثر ہوجاتا تھا۔ طبعاً اس لئے کہا کہ عقلاً آپ کو دھوکہ نہ ہوتا تھا کیونکہ عاقل دھوکہ نہیں کھایا کرتا۔ چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تفسیر موجود ہے۔

﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ یُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَیْنٰکَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ﴾ (۴)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو دھوکہ نہ ہوتا تھا۔ طرز کلام سے آپ ہر شخص کو پہچان لیتے تھے کہ یہ مومن ہے یا منافق، سچا ہے یا جھوٹا، کیونکہ ''ولتعرفنهم'' میں لام تاکید اور نون تاکید کے ساتھ کلام کو مؤکد کیا گیا ہے یعنی آپ ﷺ ضرور پہچان لیں گے۔ پس عقلاً آپ کو ہرگز دھوکہ نہ ہوتا تھا۔ اور یہاں جو فرمایا ہے: ''یُعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا'' اس سے طبعی اثر مراد ہے کہ آپ پر اس منافق کی لسانی سے طبعاً ایک گونہ اثر ہوجاتا تھا (۵) اور یہ بشری خاصہ ہے (۶) کہ

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کی پیداوار سمجھتے ہیں (۲) چرب زبان تھا (۳) چرب زبانی (۴) ''جن لوگوں کے دلوں میں مرض (نفاق) ہے کیا یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی دلی عداوتوں کو ظاہر نہ کرے گا۔ اور ہم تو اگر چاہتے تو آپ کو اُن کا پورا پتہ بتلا دیتے۔ سو آپ ان کو حلیہ سے پہچان لیتے اور آپ اُن کو طرز کلام سے (اب بھی) ضرور پہچان لیں گے'' سورۃ محمد: ۳۰۔۲۹ (۵) اس منافق کی چرب زبانی سے آپ تھوڑے سے متاثر ہوجاتے تھے (۶) یہ انسانی طبیعت کی خصوصیت ہے۔

فصیح و بلیغ زوردار کلام سے تھوڑی دیر کے لئے انسان ضرور متاثر ہوجاتا (جیسے کوئی شاعر عمدہ غزل سنادے تو سننے والا ضرور متاثر ہوتا ہے) گو اس سے عقلا دھوکہ نہیں ہوتا کیونکہ جانتا ہے کہ شاعر مبالغہ بہت کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح کوئی بلیغ آدمی زوردار تقریر کرے تو کلام کا اثر تھوڑی دیر کے لئے ضرور ہوگا، یہ بھی جانتے ہوں کہ یہ شخص جھوٹی باتیں بہت بنایا کرتا ہے۔ اسی کو حضور ﷺ فرماتے ہیں: ''اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً وَّ اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا''(۱)

پس اب دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں رہا ایک میں طبعی تاثر کا اثبات ہے دوسری میں عقلی تاثر کی نفی ہے۔

آثارِ طبعیہ

اور یہ بھی حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے ان آثار طبعیہ ولوازم بشریہ(۲) کو ظاہر کردیا تاکہ آپ پر الوہیت کا شبہ نہ ہو(۳)۔ گو بعض جہال نے آپ کو الوہیت (۴) تک پہنچادیا ہے۔ بلکہ آپ تو آپ جہلاء نے حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو بھی الوہیت پر پہنچا رکھا ہے۔

من گھڑت حکایت

چنانچہ ایک حکایت مشہور کی جاتی ہے کہ آپ کے پاس ایک بڑھیا آئی جس کا لڑکا مرگیا تھا کہ حضرت اس کو زندہ کردو۔ آپ نے فرمایا کہ اس کی عمر تو ختم ہوچکی اب زندہ نہیں ہوسکتا۔ وہ رونے اور اصرار کرنے لگی تو آپ حق تعالیٰ کی

(۱) ''بعض شعر میں حکمت ہوتی ہے اور بعض بیان میں جادو ہوتا ہے'' مسند احمد:۴/۵۹، سنن النسائی:۲/۲۲۸، کنز العمال:۶:۱۹۰۰۶، رقم الحدیث:۸۹۶۸ (۲) طبعی آثار اور انسانی لوازم کو ظاہر کردیا (۳) خدائی کا شبہ نہ ہو (۴) بعض بڑے درجہ کے جاہلوں نے آپ کو خدائی کے درجہ پر فائز کردیا۔

طرف متوجہ ہوئے اور عرض کیا کہ اس لڑکے کو زندہ کردیا جائے۔ وہاں سے خطاب ہوا کہ اس کی تقدیر میں اور حیات نہیں(۱)۔ اس لئے اب زندہ نہیں ہوسکتا۔ تو حضرت غوث رحمۃ اللہ علیہ حق تعالیٰ سے کہتے ہیں ذرا ملاحظہ کیجئے یہ حق تعالیٰ سے باتیں ہورہی کہ حضرت آپ سے کہنے کی تو اسی لئے ضرورت ہوئی کہ اس کی تقدیر میں اور حیات نہیں۔ اور اگر اس کی تقدیر میں کچھ اور زندگی ہوتی تو آپ سے کہنے کی ہی کیا ضرورت تھی پھر تو آپ مجبور ہوکر خود ہی زندہ کرتے (نعوذ باللہ) وہاں سے حکم ہوا کہ پھر تقدیر کے خلاف تو نہیں ہوسکتا۔ اس پر غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو جلال آیا اور آپ نے اپنے قوت کشفیہ سے ملک الموت (۲) کو ٹٹولا کہ وہ کہاں ہیں آخر نظر آئے تو دیکھا کہ وہ ایک تھیلے میں اُس دن کے مردوں کی روحیں بھر کر لے جارہے ہیں۔ ابھی تک ہیڈ کوارٹر پر نہ پہنچے تھے کہ غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اُن کو ٹوکا۔ اور کہا بڑھیا کے لڑکے کی روح واپس کردو تم اس کو نہیں لے جاسکتے۔ وہ انکار کرنے لگے۔ آپ نے وہ تھیلا ان کے ہاتھ سے چھین کر کھول دیا۔ جتنی روحیں تھیں سب پُھر پُھر اڑ گئیں۔ اور اُس دن جتنے مردے مرے تھے سب زندہ ہوگئے۔ تو غوثِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے حق تعالیٰ سے کہا کہ کیوں اب راضی ہوگئے ایک مردے کے زندہ کرنے پر تو راضی نہ ہوئے اب بہت جی خوش ہوا ہوگا، جب ہم نے سارے مردوں کو زندہ کردیا۔ توبہ توبہ اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰہ۔

کیا خدا تعالیٰ کے ساتھ اس طرح گفتگو کرنے کی کسی کو مجال ہے۔ مگر یہ سب حکایتیں جاہلوں نے گھڑی ہیں اور اُن کو بیان کرکے کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ وہ کام کرسکتے ہیں، جو خدا بھی نہیں کرسکتا۔ بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس کفر کا (۳)۔ جب جاہلوں نے غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو اس رتبہ پر پہنچادیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت آثار طبعیہ اور لوازمِ بشریہ (۴) کو ذکر نہ کیا جاتا تو نہ معلوم یہ

(۱) زندگی (۲) اپنے کشف کی قوت سے موت کے فرشتہ عزرائیل کو ڈھونڈا (۳) ان کفریات کی بھی کوئی حد ہے
(۴) اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طبعی آثار اور انسانی تقاضوں کو ذکر نہ کرتے تو نہ معلوم آپ کو یہ لوگ کس مقام پر پہنچاتے۔

لوگ حضور ﷺ کو کہاں پہنچاتے۔ اور اب اگر کوئی ایسی غلطی کرے تو یہ محض حماقت ہے کیونکہ قرآن میں سب باتیں بیان کر دی گئیں کہ آپ ﷺ کھاتے بھی تھے۔ سوتے بھی تھے۔ بیوی کی بھی آپ ﷺ کو ضرورت تھی۔ آپ ﷺ لسان (۱) آدمی کی بات سے متاثر بھی ہوتے تھے۔ ان آثار کے ہوتے ہوئے الوہیت کا احتمال کہاں؟۔

مجاہدہ اور لوازم بشریت

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجاہدہ سے لوازمِ بشریت اور امور طبعیہ (۲) زائل نہیں ہوا کرتے۔ اس میں بعض لوگوں کو دھوکہ ہو جاتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مجاہدہ سے لوازمِ بشریت وتقاضائے طبعی مسلوب (۳) ہو جاتے ہیں۔ پھر بعد اعتدال وتمکین (۴) کے جب ان آثار کا دعویٰ ہوتا ہے تو پریشان ہوتا ہے کہ ہائے میری ساری محنت برباد اور میرا سارا مجاہدہ ضائع گیا۔ حالانکہ یہ اعتقاد غلط ہے۔ مجاہدہ سے امور طبعیہ مسلوب نہیں ہوتے بلکہ جوش مجاہدہ سے صرف مغلوب ہو جاتے ہیں (۵) پھر بعد اعتدال کے جب ہنڈیا پک جاتی ہے تو وہ جوش نہیں رہتا بلکہ سکون ہو جاتا ہے۔ مولانا محمد علی صاحب مونگیری رحمۃ اللہ علیہ جو شاہ فضل الرحمٰن صاحب کے مجاز بھی ہیں فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے شاہ صاحب سے شکایت کی کہ ذکر میں اب وہ لطف نہیں آتا جو پہلے آتا تھا۔ فرمایا تم کو معلوم نہیں کہ پرانی جورواماں (۶) ہو جاتی ہے۔ صاحبو! قاعدہ ہے کہ جس محبوبہ سے ابھی تک وصال نہ ہوا ہو اس سے جب اول اول وصال ہوتا ہے تو کیا حال ہوتا ہے مگر بعد میں یہ حال نہیں رہتا۔ بلکہ سکون ہو جاتا ہے یہ مطلب نہیں کہ وصال کے بعد محبت نہیں رہتی۔ محبت تو اب پہلے سے زیادہ ہوتی ہے چنانچہ تجربہ ہے کہ جو تعلق پرانی بیوی سے ہوتا

(۱) چرب زبان آدمی (۲) انسانی اور طبعی تقاضے زائل نہیں ہوتے (۳) ختم ہو جاتے ہیں (۴) اعتدال اور ٹھہراؤ کے بعد جب دوبارہ یہ آثار محسوس ہوتے ہیں (۵) مجاہدے کے جوش کی وجہ سے امور طبعیہ کا احساس نہیں ہوتا (۶) پرانی بیوی مثل ماں کے محبت وشفقت کا برتاؤ کرنے لگتی ہے۔

ہے اور اس سے جتنا دل کھلا ہوا تھا نئی بیوی کے ساتھ ویسا تعلق نہیں ہوتا۔ اُس میں کسی قدر اجنبیت سی ہوتی ہے۔ مگر جوش نئی بیوی کے ساتھ زیادہ ہوتا ہے۔ پرانی بیوی کے ساتھ وہ جوش نہیں ہوتا تو بات یہ ہے کہ ابتداء میں محبت شوق کے رنگ میں ہوتی اور بعد میں اُنس کا رنگ غالب ہوتا ہے اس وقت وہ کیفیتیں نہیں رہتیں۔ جو شوق کے وقت ہوا کرتی ہیں مثلاً بات پر رونا اور استغراق کا غلبہ ہونا وغیرہ۔ مگر لوگ انہی آثار کو مقصود سمجھتے ہیں۔ اور اُنس کی حالت میں جب یہ آثار کم ہوجاتے ہیں تو پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ مقصود نہیں کہ ہر وقت شوق غالب رہے اور تقاضائے طبعی مرغوبات نفسانیہ(۱) کا کبھی نہ ہو۔ نا یہ مقصود ہے کہ دل میں حرکت پیدا ہوجائے۔ ہم جب غارِ ثور پر گئے جہاں سیدنا رسول اللہ ﷺ ہجرت کے وقت تین دن مخفی رہے تھے(۲)۔ تو پہاڑ پر چڑھنا پڑا اور بحمد للہ اس غار کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ مگر جب پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا تو سانس پھول گیا اور دل دھڑکنے لگا۔ اور ایسا کھٹکا پیدا ہوا جو مسموع ہوتا تھا(۳)۔ میں نے دوستوں سے کہا کہ لو بھائی اگر یہی حرکت قلب مدار ولایت ہے(۴) تو سب ولی ہوگئے اور اگر یہی ولایت ہے تو اس کا یہ طریقہ بہت آسان ہے کہ پہار پر چڑھ لیا کرو نہ مجاہدہ کی ضرورت ہے نہ اعمال واشغال کی۔

ذکر قلبی اور اختلاج میں فرق

شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد مولانا شاہ عبدالرحیم کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ حضرت میرا قلب جاری ہوگیا ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا مبارک ہو۔ اُس وقت اُس کے دعویٰ کو رد نہیں کیا کیونکہ وہ مرید نہ تھا۔ مدعی تھا اور مدعی کے ساتھ اہل طریق کا یہی معاملہ ہوتا ہے۔ کہ اس کی تردید نہیں کرتے۔ نہ اُس کے سامنے حقائق ومعارف بیان فرماتے ہیں۔ چنانچہ عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے ؎

(۱) نفس کے پسندیدہ طبعی تقاضے (۲) چھپے رہے (۳) دل اتنی زور سے دھڑکنا شروع ہوا کہ اس کا دھڑکنا سب کو سنائی دے رہا تھا (۴) ولایت کی علامت ہے۔

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی(۱)

بعد میں فرمایا کہ غریب کو خفقان ہوگیا ہے یعنی اختلاج قلب اس سے قلب جاری ہونے کا دھوکہ ہوگیا۔ حالانکہ ذکر قلبی اور چیز ہے اختلاج قلب (۲) اور چیز ہے۔ ذکر قلبی کے معنی ہیں رسوخ الذکر فی القلب (۳) اس کو اختلاج سے کیا تعلق (۴)۔

بکاء بالقلب

اسی طرح بعض لوگ رونے کو مقصود سمجھتے ہیں اور اعتدال کے بعد جب زیادہ رونا نہیں آتا تو اس سے مغموم ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ اگر رونا ہی ولایت ہے تو رونا کیا مشکل ہے، لاؤ ایک لاٹھی میں مارنا شروع کروں۔ ایک طرف سے سب رونے لگیں گے۔ خوب کہا ہے ؎

عرفی اگر بگر یہ میسر شدے وصال صد سال میتواں بتمنا گریستن (۵)

حدیث میں ہے: ابکوا فان لم تبکوا فتباکوا(۶)

اس سے معلوم ہوا کہ بکا (۷) مقصود نہیں کیونکہ یہ ہر حال میں امر غیر اختیاری

(۱) ''مدعی کے سامنے عشق و مستی کے اسرار مت بیان کرو اسے اپنے حال پر چھوڑ و تا کہ وہ خود پرستی کے رنج میں مر جائے'' (۲) دل کی گھبراہٹ (۳) دل میں اللہ کی یاد کا بس جانا (۴) میرے ایک عالم دوست اس غلطی میں مبتلا تھے وہ اختلاج قلب ہی کو بزرگی سمجھتے تھے ایک زمانہ میں میں نے اختلاج قلب کی شکایت کی تو کہنے لگے یہ تو خوشی کی بات ہے کہ تم کو نسبت حاصل ہوگئی اور دل جاری ہوگیا۔ یہ تو اہل نسبت کے لئے لازم ہے۔ میں نے کہا بندۂ خدا نسبت کو اختلاج سے کیا واسطہ۔ پھر میں نے اس کی حقیقت بیان کی تو کہنے لگے کہ مجھ کو دھوکہ اس سے ہوا کہ اکثر اہل نسبت اختلاج قلب کے مریض ہیں، میں سمجھا کہ بس یہی نسبت ہوتی ہوگی، میں نے کہا اہلِ نسبت سے چونکہ ذکر کی کثرت کرتے ہیں اور جہر و ضرب میں بے اعتدالی بھی ہوجاتی ہے۔ اسی لئے نسبت کے حصول کے ساتھ یہ مرض بھی جمع ہوجاتا ہے۔ ورنہ نسبت سے اُس کو کوئی تعلق نہیں۔ نسبت تو لذیذ ہے اور اختلاف باعث کلفت ہے (فشتان بینهما) منہ (۵) ''عرفی اگر رونے سے وصال میسر ہوسکتا تو میں سو سال (وصال کی) تمنا میں روسکتا'' (۶) ''روؤ اور اگر رونا نہ آئے تو رونے کی صورت بناؤ (الصحیح لسملم کتاب الذبائح:۵۷، سنن الدارمی:۸۲/۲، الدر المنثور:۱۸۱/۴) (۷) رونا۔

ہے اور ایسا غیر اختیاری مقصود نہیں ہوتا، پس جس کو رونا نہ آتا ہو وہ رونے کی صورت ہی بنالے یہ بھی کافی ہے۔ میں اس کی ایک سہل عنوان سے توضیح کرتا ہوں (۱) کہ بُکاء بالقلب (۲) بھی کافی ہے۔ کیونکہ تباکی سے (۳) مقصود بکاء بالقلب ہی تو ہے اور اس کے لئے تباکی کو اس لئے اختیار کیا کہ ظاہر کا بھی باطن پر اثر ہوتا ہے جیسا کہ باطن کا ظاہر پر ہوتا ہے آپ تجربہ کرلیں کہ ایک مغموم آدمی کچھ دیر بہ تکلف ہنسے اور دل لگی کرے تو تھوڑی دیر میں دل پر فرحت ونشاط کا اثر محسوس ہوگا۔ اور کوئی بے فکر خوش آدمی تھوڑی دیر مغموموں کی سی صورت بنا کر بیٹھ جائے تو کچھ دیر کے بعد قلب میں گرفتگی اور انقباض (۴) کا اثر پائے گا۔ جب تباکی سے مقصود یہ ہے تو جس کو بکاء بالقلب حاصل ہو وہ بے فکر رہے اور اس کو تباکی صوری کی بھی ضرورت نہیں۔ (۵)

میرے پاس بعض ذاکرین کے خطوط آتے ہیں کہ ہم کو رونا نہیں آتا۔ اس کا افسوس ہے میں لکھ دیتا ہوں کہ تمہارا دل روتا ہے اور کیا چاہتے ہو اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تم کو نہ رونے پر رنج وافسوس ہے۔ بہرحال ''يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ'' (آپ ﷺ کو اس کی گفتگو مزہ دار معلوم ہوتی ہے) میں حضور ﷺ کے تأثر بالطبعیات کا ذکر اس مسئلہ کو حل کررہا ہے (۶) کہ امور طبعیہ مجاہدہ سے زائل نہیں ہوتے ورنہ حضور ﷺ جو سید المجاہدین ہیں، اس کے سب سے زیادہ مستحق تھے آپ ﷺ پر اس منافق کی باتوں کا کچھ بھی اثر نہ ہونا چاہئے تھا۔ پس یہ غلطی ہے کہ غلبۂ شوق سے جو امور طبعیہ مغلوب ہوگئے تھے پھر اُنس کے وقت وہ عود کر آئیں تو اُن سے مغموم ہو، آخر تم نے یہ کہاں سے سمجھ لیا کہ مجاہدہ سے یہ امور مسلوب (۷) ہوجاتے ہیں، اسی لئے عارف شیرازی جن کو لوگ رند سمجھتے ہیں، حالانکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صورتاً وسیرتاً ہر

(۱) آسان عنوان سے وضاحت کرتا ہوں (۲) دل میں رونے کی کیفیت پیدا کرنا (۳) رونے کی صورت بنانے سے مقصود رونے کی کیفیت کا دل میں طاری کرنا ہی تو ہے (۴) دل میں رکاوٹ اور دل ٹوٹ جائے گا (۵) اس کو رونے کی صورت بنانے کی بھی ضرورت نہیں (۶) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طبعی تقاضوں سے متأثر ہونے سے اس مسئلہ کو حل کردیا (۷) یعنی طبعی تقاضے ختم ہوجاتے ہیں۔

طرح ثقہ تھے (۱) گو کلام رندانہ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

در راہِ عشق وسوسۂ اہرمن بسے ست ہشدار و گوش را بہ پیام سروش دار (۲)

پیام سروش سے مراد وحی ہے مطلب یہ ہے کہ اس طریق میں شیطان بہت دھوکے دیتا ہے بس تم کو ہر حال میں وحی کو پیش نظر رکھنا چاہئے اور تمام امور کو وحی پر منطبق کرو جو اعتقادات اور احوال شریعت پر مطبق نہ ہوں وہ زندقہ ہے (۳)۔ اب بتلاؤ شریعت نے یہ کہاں کہا ہے کہ امور طبعیہ کا زوال مطلوب ہے یا رونا اور چلانا مقصود ہے یا تقاضائے معصیت کا نہ ہونا مطلوب ہے۔ (۴)

امتیاز انسانیت

بلکہ میں کہتا ہوں کہ جس میں تقاضا ہو اور پھر مقتضاء پر عمل نہ کرے وہ اُس سے اکمل ہے جس میں تقاضا ہی نہیں۔ اندھا اگر دعویٰ کرے کہ میں نامحرم کو کبھی نہیں دیکھتا تو کیا کمال ہے وہ دیکھ ہی نہیں سکتا۔ گونگا اگر کہے کہ میں غیبت اور کذب کا کبھی ارتکاب نہیں کرتا کیا کمال ہے وہ تو بول ہی نہیں سکتا۔ کمال تو اُس کا ہے جو دیکھ سکتا ہے بول سکتا ہے، سن سکتا ہے اور پھر کچھ نہیں کرتا۔ انسان کو ملائکہ سے امتیاز اسی لئے ہے کہ اُن میں تقاضا نہیں اور اُس میں تقاضا ہے۔ باقی یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ ابتداء میں لذتِ ذکر کو ایسا غالب کردیتے ہیں کہ یہ تقاضا مغلوب ہو جاتا ہے۔ اگر ابتداء میں بھی لذت ذکر غالب نہ ہوتی تو عمر بھر کو تقویٰ دشوار ہوجاتا پھر جب مجاہدہ اور ذکر کو ایسا رسوخ ہوگیا کہ تقاضائے نفس کی مقاومت (۵) سہل ہوگئی اُس وقت یہ تقاضا پھر عود کرآتا ہے (۶) تاکہ مقاومت

(۱) صورت اور سیرت کے اعتبار سے قابل بھروسہ تھے (۲) ''راہِ عشق میں شیطان بہت وسوسے ڈالتا ہے اس لئے اس راہ کو وحی کی راہنمائی میں قطع کرنا چاہئے'' (۳) جو عقیدہ وحال شریعت کے خلاف ہو وہ گمراہی ہے (۴) شریعت میں نہ امور طبعیہ کو زائل کرنا مقصود ہے نہ رونا اور نہ ہی گناہ کے تقاضہ کا نہ ہو مقصود ہے (۵) نفس کے تقاضے کا مقابلہ کرنا آسان ہوگیا (۶) تقاضہ پھر لوٹ آتا ہے۔

تقاضا سے کمال ظاہر ہو(۱) اور درجات بڑھیں، بلکہ یوں کہئے کہ اس وقت ظہور ہوجاتا ہے کیونکہ عود تو وہ شے کرے جو جاتی رہی ہو اور میں کہہ چکا ہوں کہ مجاہدہ سے طبعیات کا زوال نہیں ہوتا اس لئے ظہور تقاضا(۲) کے وقت پریشان نہ ہونا چاہئے۔ بس یوں سمجھے کہ میں کون ہوں جو طبائع سے متاثر نہ ہوں جب کہ کاملین اور سیدالاکملین صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان سے متاثر ہوتے تھے۔ گو عمل کبھی نہ کرتے تھے۔ چنانچہ یہاں اعجاب ہی کا ذکر تو ہے عمل کا تو ذکر نہیں۔ غرض یہ آیت ایسے منافق کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

دین کے اعتبار سے لوگوں کی اقسام

میں نے شروع ہی میں اس پر تنبیہ کردی ہے۔ پھر ضمناً اور بھی مسائل بیان ہوگئے۔ غرض ایک قسم تو یہ ہوئی دوسری قسم ''وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَه'' الآیۃ میں مذکور ہے اس کو پہلے کا مقابل ہونے کی وجہ سے مخلص کہئے اب دونوں کو ملانے سے تکلف کی دو قسمیں ہوئیں ایک مخلص ایک غیر مخلص عام مفسرین نے تو یہاں دو ہی قسمیں بیان کی ہیں انہوں نے صرف سباق قریب کو دیکھا ہے اور بعض مفسرین نے جس کی تعیین ذہن میں نہیں رہی، اور قاضی ثناء اللہ صاحب نے اس کا ربط دور سے لیا ہے بہت عرصہ ہوا کہ میں نے یہ تفسیر دیکھی تھی اس سے بہت جی خوش ہوا، تفصیل مقام کی یہ ہے کہ اس سے اوپر حق تعالیٰ نے حج کے احکام کے ساتھ فرمایا ہے ﴿فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ﴾(۳)

(۱) تاکہ اس تقاضہ کے مقابلہ کرنے سے اس کا کمال ظاہر ہو (۲) تقاضہ ظاہر ہونے کے وقت (۳) ''یعنی جب تم مناسک حج پورا کرچکو تو خدا تعالیٰ کو یاد کرو۔ جیسا اپنے آباؤ اجداد کو یاد کرتے تھے۔ یا اُن کے ذکر سے بھی زیادہ یاد کرو'' سورۃ البقرۃ: ۲۰۰۔

زمانہ جاہلیت میں حج کے بعد منیٰ میں اہل عرب قیام کرتے اور وہاں مشاعرہ ہوتا۔ اور مفاخرت (۱) کے طور پر اپنے خاندانی فضائل کا مذاکرہ ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ذکر اللہ سے بدل دیا کہ اب بجائے ذکر دنیا کے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ جاہلیت کا طریقہ چھوڑ دو۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اب ذکر اللہ یعنی دین کے اعتبار سے لوگوں کی چند قسمیں ہیں، چنانچہ ارشاد ہے۔ ﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَ مَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ (۲)

مسلمان اس کا مصداق نہیں ہوسکتا۔ آگے دوسری قسم ہے: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (۳)

اس آیت کا سیاقِ کلام بتلا رہا ہے کہ اس کے مصداق وہ مسلمان ہیں جو طالبِ آخرت ہیں اس پر شاید یہ سوال ہو کہ جب یہ لوگ مسلمان طالب آخرت ہیں تو انہوں نے دنیا کیوں مانگی۔ اور اس سے بعض انگریزی خوانوں نے طلبِ دنیا کا مضمون سمجھ کر یہ کہا ہے کہ دنیا جس کی مذمت کی جاتی ہے اور جس کی طلب سے علماء منع کرتے ہیں، ایسی چیز ہے جس کی طلب نص (۴) میں بیان کی گئی ہے اور اس پر مدح کی گئی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دنیا کو کہاں مانگا گیا ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: ''رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا'' ''دُنْيَا'' (۵) تو نہیں فرمایا۔ اگر یوں فرماتے تو بیشک طلب دنیا مفہوم ہوتی (۶)۔ مگر نص میں (۷) تو ''رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا

(۱) بطور فخر کے (۲) ''یعنی بعض آدمی تو وہ ہیں جو (دعا میں) یوں کہتے ہیں کہ اے پروردگار! ہم کو (جو کچھ دینا ہو) دنیا میں ہی دے۔ اور اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں (یہ تو کافر ہے کیونکہ جس کو آخرت میں کچھ نہ ملے وہ کافر ہی ہے)'' سورۃ البقر: ۲۰۰ (۳) ''اور بعضے آدمی (جو کہ مومن ہیں) ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے اور آخرت میں بھی بہتری دیجئے اور ہم کو عذاب دوزخ سے بچائیے'' سورۃ البقرۃ: ۲۰۱ (۴) قرآن میں (۵) ہمیں دنیا میں دنیا عطا فرمائیے تو نہیں کہا (۶) تب تو اس کو طلب دنیا سمجھ سکتے تھے (۷) قرآن میں۔

حَسَنَةً ''وارد ہے(۱) جس میں مطلوب حسنہ ہے(۲) اور دنیا محض ظرف ہے پس اس سے طلب دنیا لازم نہیں آتی، بلکہ طلب حسنة فی الدنیا لازم آئی اس لئے ان کو طالب دنیا کہنا غلط ہے بلکہ وہ تو طالب حسنه فی الدنیا ہیں۔ اس پر شاید سوال ہو کہ پھر اُن کو طالب آخرت کہنا بھی صحیح نہ ہوگا۔ بلکہ طالب حسنہ فی آخرۃ کہنا چاہئے اس کا جواب یہ ہے کہ طلبِ آخرت کے تو معنی یہی ہیں کہ طالب حسنہ ہو۔ اب چاہے تم اُس کو طالب آخرت کہو یا طالب حسنه فی الآخرۃ کہو۔ دونوں برابر ہیں۔

اس پر اگر تم کہو پھر ہم بھی طالب دنیا نہیں ہیں۔ بلکہ طالب حسنه فی الدنیا ہیں۔ یعنی مال ودولت حسنہ ہے اور ہم اُس کے طالب ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں حسنہ سے مراد حسنہ واقعیہ ہے نہ کہ حسنہ مزعومہ(۳) اور یہ شریعت سے معلوم ہوسکتا ہے کہ حسنہ واقعیہ کیا ہے(۴) اور جس چیز کے تم طالب ہو وہ تمہارے نزدیک حسنہ ہے۔ مگر شرعاً تو وہ حسنہ نہیں ہے۔ پس شریعت پر فیصلہ ہے پس اس آیت کا مصداق وہی شخص ہوسکتا ہے جو حسنہ شرعیہ کا طالب ہو اور حسنہ شرعیہ سے بھی وہ مراد ہے جو حقیقتاً حسنہ شرعیہ ہو۔ محض صورۃً ہی حسنہ نہ ہو کیونکہ بعض افعال صورۃً دین کے کام معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقتاً دین نہیں ہوتے۔ ہم اُن سے بھی منع کرتے ہیں۔

اس سے آپ کو ہمارے انصاف کا اندازہ ہو گیا ہوگا ہم صرف صورت دنیا ہی کے مخالف نہیں بلکہ دنیا بصورت دین کے بھی مخالف ہیں(۵) جیسے بدعات وغیرہ کو گو ظاہر میں وہ دین کے کام معلوم ہوتے ہیں مگر ہم ان سے بھی منع کرتے ہیں کیونکہ دنیا کہتے ہیں مانع عن اللہ کو(۶) اور یہ مال ودولت کے ساتھ خاص

(۱) ہمیں دنیا میں بہتری عطا فرمائیے (۲) جس میں دنیا میں بھلائی کو طلب کیا ہے اور دنیا کا ذکر بطور ظرف ہے (۳) حقیقی بہتری نہ کہ وہ بہتری جو تمہارے خیال میں بہتری ہو (۴) شریعت ہی سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ حقیقی بہتری یعنی دین کیا ہے (۵) ایسی دنیا جو دین کی شکل میں ہو اسکے بھی مخالف ہیں (۶) دنیا کہتے ہیں اس کو جو اللہ سے روکے۔

نہیں۔ بلکہ بعض دفعہ ایمان بھی مانع عن اللہ ہوتا ہے (۱) جیسے وہ ایمان جس کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (۲) یعنی ظاہری ایمان جس میں حقیقت کا پتہ بھی نہ ہو۔ ایسے ہی بعض اعمال بھی جو صورۃً دین ہیں۔ مگر حقیقت دین اُن میں موجود نہیں۔ مانع عن اللہ ہیں (۳) یہاں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم صرف طالبان دنیا ہی کی مذمت نہیں کرتے۔ بلکہ طالبان دین کی بھی مذمت کرتے ہیں، جو حقیقت میں دین کی صورت میں دنیا ہی کے طالب ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی نسبت مولانا فرماتے ہیں ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست　　پس بہر دستے نباید داد دست
گر بصورتِ آدمی انسان بدے　　احمد و بوجہل ہم یکساں بدے
ایں کہ می بینی خلافِ آدم اند　　نیستند آدم غلافِ آدم اند(۴)

انسانوں کی اقسام

بہر حال اس میں تو شک نہیں کہ پہلی آیت کا مصداق کافر ہے اور دوسری آیت کا مصداق مومن۔ عام مفسرین نے تو یہی دو قسمیں سمجھی ہیں اور آگے ''مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ'' سے مستقل کلام لیا ہے۔
مگر قاضی ثناء اللہ صاحب نے مجموعہ کلام میں چار قسمیں سمجھی ہیں دو تو وہ ہی جو ابھی مذکور ہوئیں۔ اور دو ''مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ'' الخ اور ''مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ'' الخ۔

---

(۱) صرف مال و دولت ہی اللہ سے رکاوٹ نہیں بنتا بلکہ بعض ایمان بھی رکاوٹ بن جاتا ہے جیسے اس آیت میں مذکور ہے (۲) ''اور لوگوں میں جو شخص کہتا ہے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر حالانکہ وہ ایمان والے نہیں'' سورۃ البقرۃ: ۸ (۳) اللہ سے روکنے والے ہیں (۴) بہت سے شیاطین انسانی شکل وصورت میں ہوتے ہیں اس لئے ہر ایک کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ نہیں دینا چاہئے اگر آدمی کی شکل وصورت کا ہر شخص انسان کامل ہوتا تو احمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل دونوں یکساں ہوتے۔ جس کو میں آدمی کی شکل میں دیکھ رہا ہوں یہ تو انسانیت ہی کے خلاف ہے یہ آدمی نہیں بلکہ آدمی نما ہے۔

خلاصہ فرق دونوں توجیہوں کا یہ ہے کہ عام مفسرین کے نزدیک تو یہاں پر دو تقسیمیں ہیں۔ تقسیم اول انسان کی تقسیم ہے۔ مومن و کافر کی طرف۔ تقسیم ثانی انسان کی تقسیم ہے۔ منافق اور مخلص کی طرف (۱) مگر یہ اقسام باہم جمع ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ کافر ومنافق جمع ہوسکتے ہیں اور مؤمن ومخلص جمع ہوسکتے ہیں۔ اس تقسیم کی ایسی مثال ہے جیسے نحاۃ (۲) نے کلمہ کی تقسیم کی ہے اسم وفعل وحرف کی طرف، پھر دوبارہ تقسیم کی ہے مذکر ومونث کی طرف۔ وعلیٰ ہٰذا تو یہ اقسام باہم جمع ہوسکتی ہیں۔ یہ تو جمہور مفسرین کی توجیہ کا حاصل ہے۔

تفسیر آیت

اور بعض دوسرے مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں ایک ہی تقسیم ہے اور مقسم بھی واحد ہے (۳) یعنی انسان مقسم ہے اور اسکی دو قسمیں ہیں مجاہر ومنافق (۴) اور مومن کی دو قسمیں ہیں ایک طالبِ آخرت اور ایک طالب حق۔ پس کل چار قسمیں متبائن ہوگئیں کافر مجاہر اور کافر غیر مجاہر۔ اور مؤمن طالب آخرت اور مومن طالب حق بدوں التفات الی الآخرۃ (۵) بدوں اس کے کہ آخرت کا طالب ہو۔ ﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَ مَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ (۶) میں کافر مجاہر کا ذکر ہے جو کہ دنیائے محضہ کا طلب ہے اور ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً﴾ ''اور بعضے آدمی (جو مؤمن ہیں) ایسے ہیں جو کہتے

(۱) یہ چار قسمیں اس طرح ہوئیں۔ ا۔ مومن۔ ۲۔ کافر۔ ۳۔ منافق۔ ۴۔ مخلص (۲) علم نحو کے ماہرین (۳) ایک ہی تقسیم بیان کی جارہی ہے اور جس کی تقسیم بیان کی جارہی ہے وہ بھی ایک ہے۔ یعنی انسان اور اس کی دو قسمیں ہیں مومن اور کافر (۴) کافر کی دو قسمیں ہیں کافر مجاہر اور کافر منافق (۵) ایسا مؤمن جو طالب حق تو ہے لیکن آخرت کی طرف اس کو التفات نہیں (۶) ''پس بعض آدمی (جو کافر ہیں) ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو جو کچھ دینا ہے دنیا ہی میں دے دیجئے اور ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں''۔ البقرۃ: ۲۰۰

ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی بہتری دیجئے اور آخرت مین بھی بہتری دیجئے'' الخ۔ میں مومن طالب آخرت کا ذکر ہے۔ اور '' وَمِنَ النَّاس مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُه '' میں کافر غیر مجاہر یعنی منافق کا ذکر ہے اور '' مِنَ النَّاس مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهٗ'' میں مومن طالب حق کا ذکر ہے جو محض طالب رضاء ہے۔ آخرت اور دنیا دونوں کی طرف ملتفت نہیں (۱)۔ یہ تو تفسیر آیت کی تقریر تھی۔ اور میں نے تفسیر کو اس وقت اس لئے بیان کیا حالانکہ مجھے اس وقت چند مسائل سلوک کے بیان کرنا ہیں۔ علوم کا بیان مقصود نہ تھا کیونکہ مخاطب خود اہل علم ہیں اُن کو اُس کی ضرورت نہ تھی مگر خود میرا مقصود تفسیر ہی پر موقوف ہے۔ اس لئے تفسیر کو بطور مقدمہ کے بیان کر دیا۔

بیان طریق استنباط

اب میں مسائل کو بیان کرنا چاہتا ہوں وہ مسائل بہت ضروری ہیں اس لئے اس وقت اُن کے بیان کو اختیار کیا ہے گو وقتی ضرورت نہیں ہے بلکہ ضرورت عامہ ہے جو کسی خاص وقت کے ساتھ مقید نہیں اور اس جہت (۲) سے یہ وقتی ضرورت سے بھی زیادہ اہم ہے اس لئے غور سے سننا چاہئے اور چونکہ اب اقتضاء عمر کے لحاظ سے حافظہ اچھا نہیں رہا تو میں نے سہولت ضبط کے لئے ان مسائل کو ایک پرچہ پر لکھ لیا ہے تا کہ کوئی بات رہ نہ جائے۔ آج کل مجھے اثناء (۳) بیان میں یاد نہیں رہتا کہ کیا کیا باتیں بیان کرنا ہیں اسی لئے درمیان میں اکثر کاتب سے پوچھنا پڑتا ہے۔ اور گو ایسا اتفاق پہلے بھی ہوتا تھا مگر کم اور اب یہ بات زیادہ پیش آتی ہے اب وہ مسائل سنئے۔

ایک مسئلہ تو اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ طلب کا درجہ علیا (۴) کیا ہے؟ یہاں بطور دفع دخل مقدر کے اس بات پر تنبیہ کئے دیتا ہوں کہ چونکہ تفسیریں دونوں

---

(۱) جو صرف اللہ کی رضا کا طالب ہے اس کو دنیا وآخرت کی طرف کچھ التفات نہیں (۲) اس حیثیت سے (۳) دوران بیان (۴) بلند درجہ کیا ہے۔

محتمل ہیں۔اس لئے بعض مسائل ایک تفسیر پر مستنبط ہیں اور بعض دوسری تفسیر پر کیونکہ تفسیریں دونوں صحیح اورآیت پر منطبق ہیں۔ پس طلبہ کو ''اِذَاجَـآءَ الِاحتِمَـالُ بَـطَـلَ الِاستِـدلَالُ '' کے قاعدہ سے ان مسائل کو رد نہ کرنا چاہئے، کیونکہ یہ قاعدہ وہاں ہے جہاں دونوں احتمال صحیح نہ ہوں۔ بلکہ ''لَا عَـلَـی التَّعِیِینِ ''ایک ہی احتمال صحیح ہو اور یہاں یہ بات نہیں بلکہ دونوں احتمال صحیح ہیں کیونکہ ان میں باہم کچھ منافات نہیں ہے۔اس لئے جس تفسیر پر بھی استنباط ہو صحیح ہوگا۔

ایک تفسیر

سوان دونوں تفسیروں میں سے ایک تفسیر پر جب یہ کہا جائے کہ ''مِـــــنَ الـنَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَه" (اور بعض آدمی ایسا بھی ہے جو اپنی جان تک بھی صرف کر چکا ہے) میں طالب حق غیر طالب آخرت کا بیان ہے اور یہ چوتھی قسم ہے، یہ معلوم ہوا کہ طلب کا درجہ علیا یہ ہے کہ محض حق کی طلب ہو(۱) جنت وغیرہ کی طلب نہ ہو اور مومنین کی اس قسم خاص کا پہلی قسم یعنی طالبانِ جنت سے علیحدہ ہونا دوسری نصوص سے بھی مؤید ہے چنانچہ سورہ واقعہ میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿فَاَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ مَآ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ﴾(۲)

ظاہر ہے کہ یہاں ''اصحٰب المیمنۃ '' سے مراد ''اصحٰب جنت ''ہیں اور'' اصحٰب المشئمۃ '' سے مراد کافر ہیں۔مگر ''اصحب المیمنۃ'' سے مراد کل اصحاب جنت نہیں صرف عامۂ مومنین مراد ہیں اور خواص کا ذکر آگے ہے۔ ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾(۳)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ تیسری قسم ہے جو'' اصحٰب الجنۃ '' سے بھی ممتاز ہے

(۱) صرف رضاءِ الٰہی کا طالب ہو(۲) ''پس جو داہنے ہاتھ والے ہیں وہ داہنے والے کیسے اچھے ہیں اور بائیں ہاتھ والے وہ بائیں والے کیسے برے ہیں'' سورۃ الواقعۃ:۹(۳) ''اور جو اعلیٰ درجہ کے ہیں وہ تو اعلیٰ درجہ کے ہیں اور جو خدا تعالیٰ کے ساتھ خاص قرب رکھنے والے ہیں'' سورۃ الواقعۃ:۱۰۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لوگ کہیں جنت سے الگ رہیں گے۔ نہیں سکونت کے اعتبار سے بھی اصحاب جنت ہیں۔ مگر طلب کے اعتبار سے اُن سے الگ ہیں۔

پس ''اصحٰب الجنة'' کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ''من یطلب الجنة''(۱) دوسرے ''من طلب الحق وان سکن الجنة''(۲) اور ''سابقون'' کے تکرار سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ دونوں مذکورہ طبقوں سے سابق ہیں پس اصحاب جنت سے بھی سابق ہوئے یہی معنی ہیں اہل جنت سے ان کے ممتاز ہونے کے آگے اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ ''اُولٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ ''(وہ اللہ تعالیٰ کے خاص مقرب ہیں) کے بعد ''فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ '' بھی فرمادیا تاکہ یہ شبہ نہ ہو کہ شاید مقرب ہونے سے مراد یہ ہے کہ نعوذ باللہ وہ خدا تعالیٰ کی گود میں بیٹھیں گے۔ تو بتلا دیا کہ وہ بھی جنت ہی میں ہوں گے۔ مگر دوسروں سے مقرب ہوں گے۔ بہرحال اہل جنت میں دو قسمیں ہونا نصوص سے صراحۃً معلوم ہورہا ہے اور اہلِ طریق کے کلام میں تو اس کی بہت تصریح ہے۔

طلب کا اعلیٰ درجہ

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ طلب کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی چیز کا طالب نہ ہو، نہ جنت کا نہ دوزخ سے بچنے کا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جنت کو طلب نہ کرے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ بالذات طلب نہ کرے۔ گو بعض اہل حال ایسے بھی ہیں جنہوں نے یہ صاف کہہ دیا کہ ہم کو نہ جنت کی پرواہ ہے نہ دوزخ کی۔ مگر یہ لوگ محقق نہیں ہیں ہاں مغلوب ہیں۔ چنانچہ اہلِ حال ایسے بہت گزرے ہیں جنہوں نے طالبانِ جنت پر انکار کیا ہے۔

صاحب حال لوگ

حضرت رابعہ بصریہ کا واقعہ ہے کہ وہ ایک دن ایک ہاتھ میں پانی اور ایک

(۱) جو جنت کے طالب ہوں (۲) دوسرے جو حق کے طالب ہوں اگرچہ جنت میں سکونت پذیر ہوں۔

ہاتھ میں آگ لئے ہوئے دوڑی جارہی تھیں کسی نے پوچھا حضرت یہ کیا ہے فرمایا لوگ کہیں جنت کے طالب ہیں کوئی دوزخ سے ڈرتا ہے میرے محبوب کا نام کوئی نہیں لیتا۔ حضرت رابعہ کی یہ بات ویسی ہی تھی۔ جیسے کالے خاں وکیل ہمارے ایک دوست تھے۔ کانپور میں ایک بار اُن کا لکھنؤ جانا ہوا تو ایک شیعی نے اُن سے کہا کہ امام صاحب کی مجلس میں نہیں چلتے۔ کالے خان نے کہا۔ امام صاحب کی مجلس کہاں ہے۔ کہا! سبحان اللہ! آج کل تو سینکڑوں جگہ امام کی مجلس ہورہی ہے آپ کو معلوم ہی نہیں۔ کالے خان کے کہا میں نے تو آج ہی نام سنا ہے۔ مجھے لکھنؤ میں آئے ہوئے کئی روز ہوگئے۔ اس وقت تک بھی نہیں سنا کہ یہاں امام صاحب کی مجلس بھی ہوتی ہے۔ اور اگر آپ کو یقین نہ آئے تو تھوڑی دیر تشریف رکھئے۔ ابھی معلوم ہوجائے گا۔ چنانچہ کچھ دیر میں ایک شخص آیا کہ فلاں نواب صاحب کے یہاں مجلس ہے پوچھا کاہے کی مجلس ہے کہا فیرینی کی۔ اسی طرح کئی آدمی آئے کسی نے حلوے کی مجلس بتلائی اور کسی نے نان گوشت کی کالے خان نے کہا حضرت آپ نے دیکھ لیا ان میں سے کسی نے بھی یہ کہا کہ امام صاحب کی مجلس ہے۔ ہر شخص کھانے کی مجلس بتلاتا ہے۔ وہ شیعی کہنے لگا کہ تم تو دل لگی کرتے ہو میاں یہ سب مجلسیں امام ہی کی ہیں۔ امتیاز کے لئے کھانے کا نام لے دیا۔ گو یہ تاویل صحیح تھی مگر وہ شیعی امام کا عاشق ہوتا تو اُس کو اس عوان ہی سے ضرور ناگواری ہوتی۔ اسی طرح حضرت رابعہ بصریہ نے فرمایا کہ میں آج جنت دوزخ کا فیصلہ کئے دیتی ہوں۔ آگ سے جنت کو جلادوں گی اور پانی سے دوزخ کو ٹھنڈا کردوں گی، تاکہ پھر کوئی ان کا نام نہ لے۔ میرے محبوب ہی کا نام لیں مگر یہ لوگ صاحب حال تھے یہ لوگ معذور ہیں غیر صاحب حال کو ایسی بات کہنے کی اجازت نہیں جیسے بچہ باپ کی داڑھی کھینچ لے تو غصہ نہیں آتا۔ مگر اُس کو دیکھ کر سیانا لڑکا بھی یہ حرکت کرنے لگے جس کے ہوش وحواس درست ہیں تو وہ جوتے کھائے گا کہ یہ کیا نالائق حرکت

ہے مگر آج کل اہل حال کو دیکھ کر بعض غیر اہل حال بھی ایسی باتیں بنانے لگتے ہیں۔ ایسے مدعیوں کو مولانا خوب لتاڑتے ہیں۔

حرف درویشاں بدزدو مردوزن تابہ پیش جاہلاں خواند فسوں(۱)

اور فرماتے ہیں ؎

ظالم آں قومی کہ چشماں دوختند از سخنہا عالمے را سوختند(۲)

مولانا نے ان کی ایسی خبر لی ہے کہ ایسا تو کسی عالم نے بھی نہیں کیا۔ غرض ایسے مغلوب بہت گزرے ہیں۔ جنہوں نے طلب جنت سے انکار کیا اور کہا ہم کو نہ جنت کی پرواہ ہے نہ دوزخ کی۔

اقسام طلب

مگر محققین یوں کہتے ہیں کہ جیسے طلب جنت کی دو قسمیں ہیں اسی طرح استغناء عن الجنۃ (۳) کی بھی۔ ایک تو یہ کہ براہ راست جنت کو طلب کیا جائے گا اعتقاد تو تبعاً طلب کرنے کا ہے مگر اُس وقت طالب کی نظر میں نعماء جنت مستحضر ہوتی ہے (۴)۔ اُن کی وجہ سے جنت کو مانگتا ہے جیسے شادی سے اعتقاداً تو اولاد بھی مطلوب ہے۔ مگر شادی کے وقت اس کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ محض تمتع (۵) کا خیال ہوتا ہے۔ یہ درجہ ادنیٰ ہے اور اس کی بھی اجازت ہے کیونکہ نصوص میں ہے۔ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ (اس طرح عمل کرنے والے اس کی طرح عمل کرسکتے ہیں) اور فِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (اور حرص کرنے والوں کو ایسی چیز کی حرص کرنا چاہئے)

جس کے اطلاق میں یہ درجہ بھی داخل ہے۔

دوسرے: یہ کہ جنت کے طالب اس لئے ہیں کہ وہاں حق تعالیٰ کی

(۱) درویشوں کے حالات کو جاہلوں کے سامنے بیان کرتے ہیں تاکہ مردوں اور عورتوں میں اپنا مقام بلند ہوجائے (۲) ''بڑے ظالم تھے وہ لوگ جنہوں نے آنکھیں بند کرکے ایسی باتوں سے ایک عالم کو حیران کردیا'' (۳) جنت سے بے نیازی ظاہر کرنے کی بھی دو قسمیں ہیں (۴) براہ راست جنت اس لئے طلب کرتا ہے کہ اس وقت اس کے پیش نظر جنت کی نعمتیں ہیں (۵) صرف لذت کا خیال ہے۔

رضاء ولقا(۱) حاصل ہوگی۔ یہ عشاق کا مذاق ہے۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

عاشقان جنت برائے دوست می دارند دوست(۲)

اور مطلقاً طلب جنت پر کیسے نکیر ہوسکتی ہے۔ جبکہ اس درجہ میں جنت کی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طلب فرماتے ہیں۔

اللّٰھمّ انّی اسئلك الجنّة وما قرب الیھا من قول او عمل۔(۳)

اس سے معلوم ہوا کہ جنت مطلقاً غیر مطلوب نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طلب کیوں فرماتے۔

اور ایک درجہ اور ہے وہ اس سے بھی باریک ہے وہ یہ کہ جنت کو براہ راست طلب کرتے ہیں۔ مگر نعماء کی(۴) وجہ سے نہیں بلکہ عبدیت کی وجہ سے یہ وہ لوگ ہیں جن پر عبدیت کا غلبہ ہے وہ اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ اپنے کو طالب حق کہیں۔ بلکہ وہ محبوب سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس چیز کو طلب کریں۔ وہاں سے حکم ہوا کہ جنت مانگو۔ اس لئے مانگتے ہیں، اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک معشوق کی نسبت کسی کو خبر ہوجائے کہ جو کوئی اس سے آم مانگتا ہے اُس سے بہت خوش ہوتا ہے اب بعضے تو آم کے عاشق تھے۔ اس لئے مانگنے آئے اور بعضے محبوب ہی کے عاشق تھے۔ انہوں نے محبوب کے سوا کسی اور چیز کو مانگنا غیرت عشق کے خلاف سمجھا اور بعضے وہ تھے جنہوں نے یہ خیال کیا کہ جب محبوب آم مانگنے سے خوش ہوتا ہے تو اُسے خوش کرنے کے لئے ضرور مانگنا چاہئے۔

پھر اُن میں بھی دو جماعتیں ہیں ایک تو وہ جو آم ہی مانگنے آئے۔ مگر ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ چونکہ آپ آم مانگنے سے راضی ہوتے ہیں اس لئے مانگتے ہیں

(۱) اللہ سے ملاقات اور اس کی خوشنودی حاصل ہوگی (۲) عاشق جنت کو دوست کی وجہ سے محبوب رکھتے ہیں کہ دوست سے ملاقات جنت میں ہوگی (۳) ''اے اللہ میں جنت کا سوال کرتا ہوں اور اس چیز کا جو اس سے قریب کردے قول یا عمل''، اتحاف السادة المتقین: ۳۱۰/۸، کنز العمال: ۲۹۱۲، صفة الصفوة: ۲۰۸ (۴) نعمتوں کی وجہ سے نہیں۔

ورنہ اصل مطلوب تو آپ ہیں۔ یہ عشاق متوسطین (۱) ہیں۔ کاملین اس کو بے ادبی سمجھتے ہیں کہ زبان سے آم کا مطلوب نہ ہونا جتلایا جاوے اور محبوب میں مطلوبیت کے حصر کا دعویٰ کیا جاوے۔ان کی یہ حالت ہے کہ مطلوب تو ان کو محبوب ہی ہے مگر اپنے عشق اصلی کو ظاہر کرتے ہوئے شرماتے ہیں کہ اپنے کو کس منہ سے محبوب کا عاشق کہیں ہم اس قابل تو نہیں لاؤ محبوب کے محبوب ہی کا عشق ظاہر کریں۔ اب وہ سامنے آ کر آم کی طلب اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ جس سے دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی آم ہی کے عاشق ہیں۔ اسی کے واسطے آئے ہیں۔

اسی طرح یہاں سمجھو کہ کاملین غلبۂ عبدیت کی وجہ سے جنت کو اس طرح طلب کرتے ہیں جیسے خود جنت ہی مطلوب ہے۔ حالانکہ حقیقت میں اُن کو محض رضا مطلوب ہے۔ مگر اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتے۔ کہ اپنے کو طالب حق کہیں۔ اس لئے جس چیز کے مانگنے کا محبوب نے امر کردیا ہے (۲)۔ نہایت شوق سے اُسی کو مانگتے ہیں، پس پہلی جماعت تو جنت کی طالب من حیث الجزائر ہے اور دوسری جماعت مغلوب الحال ہے اور تیسری جماعت کی طلب لامتثال الامر ہے جس میں رضا غایت ہے اور جنت اس کا ذریعہ ہے اور چوتھی جماعت کی رغبت الی الجنت اس لئے ہے کہ وہ محبوب کی محبوب ہے اس لئے ان کو بھی محبوب ہے۔

مقامِ کمال

اسی وجہ سے وہ براہ راست جنت کی طلب کرتے ہیں یہ کاملین کا درجہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کاملین اسی مقام پر ہیں ان کا پہچاننا مشکل ہے کیونکہ ان کی طلب ظاہر میں جنت پرستوں کی طلب سے مشابہ ہوتی

(۱) یہ درمیانہ درجہ کے عاشق ہیں (۲) محبوب نے حکم دیدیا۔

ہے تو ظاہر بین (۱) ان کی حالت کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اس میں کون سا کمال ہے۔ یہ تو وہی ہے جس پر ذوق فتویٰ لگا رہا ہے۔

کب حق پرست زاہد جنت پرست ہے　　　حوروں پر مر رہا ہے شہوت پرست ہے

اس مرتبہ والے کو ذوق نہیں سمجھ سکتا، ہاں صاحب ذوق سمجھتا ہے کیونکہ یہ شخص جنت سے تو کیا محبوب کی ادنیٰ نعمت سے بھی استغناء ظاہر نہیں کرسکتا۔ جناب رسول اللہ ﷺ واقعی سید العابدین ہیں آپ جنت سے تو کیا استغناء فرماتے۔ آپ ﷺ کی عادت تھی کہ کھانا کھا کر فرمایا کرتے تھے۔

غیر مودع ولا مکفور ولا مستغنی عنه ربّنا (۲)

یعنی اس کھانے کو ہمیشہ کے لئے رخصت نہیں کرتے۔ شام کو پھر مانگیں گے اور نہ اس کی بے قدری کرتے ہیں اور نہ اس سے استغناء ظاہر کرتے ہیں بلکہ ہم ہر وقت اس کے محتاج ہیں کیونکہ آپ کی عطا ہے، اس حدیث میں آپ کھانے کی طرف اس طرح احتیاج ظاہر کر رہے ہیں، جیسے کوئی کھانے کا عاشق ظاہر کیا کرتا ہے مگر حقیقت میں آپ کو کھانے کا عشق بالذات نہ تھا۔ بلکہ عطاءِ حق کی محبت تھی۔ مگر منتہی کی حالت مبدی جیسی ہوجاتی ہے۔ اس لئے اس کا پہچاننا مشکل ہے اسی لئے انبیاء علیہم السلام کو کفار نے نہ پہچانا کیونکہ اُن میں کوئی شانِ امتیاز ظاہر میں نہ تھی، چنانچہ کفار کہتے تھے۔ ﴿مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ﴾ (۳) یعنی اس رسول کو کیا ہوا کہ کھانا بھی کھاتے ہیں اور بازار میں بھی چلتے پھرتے ہیں ایسے تو ہم بھی ہیں اگر کوئی متوسط صوفی ہوتا جو حجرہ سے آگے قدم نہ بڑھاتا اور چالیس دن کا فاقہ کیا کرتا اس کے سب معتقد ہوجاتے اس لئے کفار

(۱) جس کی ظاہر پر نظر ہوتی ہے (۲) الصحیح لمسلم: ۱۶۲۶، مسند احمد: ۲/۶، فتح الباری: ۵۸۱/۹ (۳) سورۃ الفرقان: ۷۔

متوسطین سے بہت ڈرتے ہیں کہتے ہیں یہ تو اوتار ہے اس نے چالیس دن سے کچھ بھی نہیں کھایا، بھلا انسان سے کہیں ایسا ہوسکتا۔

قیاسِ فاسد

اور انبیاء علیہم السلام کو بازار میں پھرتا ہوا دیکھا۔ اُن کو اپنے اوپر قیاس کرنے لگے۔

ہاں پہچاننے والا جانتا ہے کہ اس میں اور دوسروں میں کیا فرق ہے۔ دوسرے بازار کے اندر ہیں اور اس کے اندر سارا بازار ہے بلکہ تمام عالم ہے ؎

آسماں ہاست در ولایتِ جاں　　کار فرمائے آسمان جہاں
درہ رہ روح پست و بالا ہاست　　کوہ ہائے بلند و صحرا است[1]

اور اُن کے اس قیاس فاسد کی ایسی مثال سمجھتا ہے جیسے ایک گنوار کی حکایت میرے ایک دوست نے ابھی قریب زمانہ میں بیان کی تھی۔ کہ قاری عبدالرحمٰن پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ سے اُس نے قرآن سنانے کی درخواست کی۔ قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سنادیا تو وہ کیا کہتا ہے کہ جیسا میں پڑھوں ویسا ہی تو پڑھے۔ میں مَردانی بولی میں پڑھوں تو جانانی (زنانی) بولی میں پڑھے ہے۔ اُس نے یہ قدر کی قاری صاحب کے علم تجوید کی۔ اسی طرح مولانا نے طوطی کی حکایت لکھی ہے۔ کہ ایک تاجر کی دکان پر ایک طوطی تھی وہ بہت باتیں کرتی تھی۔ اُس کی وجہ سے دکان کی بڑی رونق تھی۔ ایک دفعہ تاجر کہیں گیا ہوا تھا۔ کہ دکان میں بلی آ گئی طوطی اُس کو دیکھ کر ڈری اور تیل کی بوتلوں کے پیچھے چھپ گئی۔ اس کی اس حرکت سے روغن بادام

(۱) ''ولایت جان میں بہت سے آسمان ہیں جو ظاہری آسمان میں کارفرمائیں روح باطن کے راستہ مین پست و بالا (نشیب وفراز) اور کوہ وصحرا موجود ہیں''۔

کی شیشی گر پڑی جس سے تمام تیل گر گیا تاجر واپس آیا تو بادام روغن کی شیشی ٹوٹی ہوئی پائی اور طوطی کو جگہ سے بے جگہ بیٹھا ہوا دیکھا اُس کو غصہ آیا کہ یہ شیشی اس نے گرائی ہے طوطی کو بہت مارا۔ یہاں تک کہ گنجا کر دیا۔ اب طوطی نے بولنا ہی چھوڑ دیا۔ ہر چند تاجر خوشامد کرتا وہ بول کر ہی نہ دیتی۔ اب وہ جگہ جگہ دعائیں کراتا پھرتا اور اپنی حرکت پر پچھتاتا تھا۔ کہ میں نے اسے کیوں مارا۔ اس کے گونگا ہونے سے تو میری دکان کی رونق ہی جاتی رہی۔ اتفاق سے ایک دن دکان کے سامنے سے ایک گنجا گزرا اُس کو دیکھ کر طوطی بے ساختہ بولی۔

ازچہ اے کل باکل آمیختی تو مگر از شیشہ روغن ریختی (۱)

طوطی نے اس کو بھی اپنے اوپر قیاس کیا۔ مولانا فرماتے ہیں:

از قیاسش خندہ آمد خلق را او چو خود پنداشت صاحبِ دلق را(۲)

اس کے بعد فرماتے ہیں۔ کہ یہی حال ہمارا ہے کہ ہم بھی سب کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں ۔

کار پاکاں را قیاس از خود میگرد گرچہ ماند در نوشتن شیر وشیر
جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد کم کسے زابدلال حق آگاہ شد
گفتہ اینکہ ما بشر ایشاں بشر ما وایشاں بستۂ خوابیم وخور(۳)

حقیقت میں کاملین کو اپنے اوپر قیاس کرنا غلطی ہے۔

منتہی کی حالت

مگر کاملین کو لوگ اس واسطے اپنے اوپر قیاس کر لیتے ہیں کہ وہ متوسطین

(۱) کہ میاں تم کیوں گنجے ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے تم نے بھی بوتل میں سے تیل گرایا ہوگا'' (۲) ''اس کے خیال سے لوگ مسکرا اُٹھے کیونکہ اس نے گدڑی والے کو اپنی طرح سمجھا'' (۳) '' نیک لوگوں کو اپنے اوپر قیاس مت کرو جیسے لکھنے میں شیر (درندہ) اور شیر (دودھ) یکساں ہے تمام دنیا اسی خام خیالی کی وجہ سے گمراہ ہوگئی کہ انہوں نے اولیاء اللہ کو نہیں پہچانا کہنے لگے ہم بھی انسان ہیں وہ بھی انسان ہیں وہ بھی کھاتے پیتے ہیں''۔

کی طرح شانِ امتیاز کے ساتھ نہیں رہتے۔

چنانچہ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ حج کو گئے اور طواف کیا تو کعبہ کو ندارد پایا یعنی روح کعبہ کو موجود نہ پایا۔ جو ایک خاص تجلی ہے۔ حق تعالیٰ سے دریافت کیا کہ کعبہ کہاں چلا گیا الہام ہوا کہ فلاں بزرگ کی زیارت کو گیا ہے۔ مگر حضور ﷺ نے ایک دن بھی اس پر اکتفاء نہ کیا۔ بلکہ خود جہاد کر کے خود زیارت کعبہ کو تشریف لے گئے۔ نیز حضور ﷺ نے اور جملہ انبیاء علیہم السلام نے اپنے اختیار سے کبھی فاقہ نہیں کیا اور روزہ بھی رکھا تو سحری میں پیشگی کچھ ضرور کھالیا۔ چاہے ایک چھوہارہ ہی ہو۔ کھانے کا نام تو ہو گیا اب اس حالت کو دیکھ کر لوگ کہیں گے کہ یہ کھانے کے کیسے پابند ہیں۔ روزہ بھی رکھا تو دو وقت کھانے کا معمول نہ چھوڑا۔ اس حالت میں کامل کو کون پہچانے، اور اُس سے کون ڈرے۔ غرض منتہی کی حالت مبتدی کے مشابہ ہوتی ہے اور یہ مبتدی کے لئے بھی فضیلت ہے کہ اس کو کاملین سے مشابہت ہے اس طرح مبتدی ''من تشبه بقوم فهو منهم'' [1] کے قاعدے سے صورۃً منتہیین میں داخل ہو گیا۔ سبحان اللہ! شریعت بھی کیا عجیب ہے کہ مبتدی کو بھی فضیلت سے محروم نہ رکھا ۔

بہار عالم حسنش دل وجان تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت رابوار باب معنیٰ را [2]

صوفیا نے لکھا ہے کہ سالک کی دو قسمیں ہیں ایک تو صوفی ہے ایک متصوف ہے۔ یعنی صوفیوں کی صورت بنانے والا اس طرق میں متصوف کی بھی فضیلت ہے یہ بھی محروم نہ رہے گا۔ بہرحال چار قسم کے آدمی ہوئے۔

---

(۱) ''جو شخص جن لوگوں کی مشابہت اختیار کرے وہ انہیں میں سے ہے'' الصحیح للبخاری:۱۱۰/۸، سنن الترمذی:۲۳۳۳، سنن ابن ماجۃ:۴۱۱۴ (۲) اس کے عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل وجان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل وجان کو بو سے تازہ رکھتی ہے''۔

(۱) ایک طالب دنیائے محضہ مجاہر (۲) ایک طالب دنیائے محضہ منافق (۳) ایک طالب آخرت (۴) ایک طالب حق اور ''مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَہٗ'' میں چوتھی قسم کا ذکر ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ''یَشْرِیْ نَفْسَہٗ'' کے کیا معنی ہیں۔ شانِ نزول پر نظر کرکے مفسرین نے اس کی توجیہ میں اختلاف کیا ہے۔

شانِ نزول

شانِ نزول اس کا حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہجرت ہے جب وہ مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ کو چلے تو کفار نے اُن کا تعاقب کیا۔ اس وقت کفار اسلام سے تو روکتے ہی تھے۔ ہجرت سے بھی روکتے تھے۔ چنانچہ حضور ﷺ کا بھی تعاقب کیا تھا۔ حضور ﷺ چونکہ راتوں رات مکہ سے چل کر غارِ ثور میں چھپ گئے تھے۔ اس لئے کفار کو پتہ نہ چلا کہ آپ ﷺ کدھر تشریف لے گئے ہیں۔ مگر اُس زمانہ میں قیافہ شناس بڑے ستم کے تھے جو پیر کا نشان دیکھ کر بتلا دیا کرتے تھے کہ یہ فلاں شخص کا قدم ہے اور وہ اس طرف سے گیا ہے۔ چنانچہ کفار نے ایک قیافہ شناس کو بلایا جس نے نشان قدم دیکھ کر پہچان لیا اور نشان دیکھتا دیکھتا غارِ ثور تک پہنچ گیا۔

یہاں پہنچ کر ٹھہر گیا اور کہنے لگا کہ بس یہاں سے آگے نہیں بڑھے۔ کفار نے اُس کو احمق بنایا کہ تو پاگل ہوا ہے اگر یہاں سے آگے نہیں بڑھے تو کیا آسمان پر چلے گئے یا زمین میں اُتر گئے۔ قیافہ شناس نے کہا چاہے کچھ ہی ہو۔ مگر یہاں سے آگے نہیں بڑھے۔ کفار یہ سب باتیں غار کے اوپر کھڑے ہوئے کررہے تھے۔ اگر ذرا اپنے قدموں کی طرف دیکھ لیتے تو حضور ﷺ پر نظر پڑجاتی۔ مگر خدا تعالیٰ نے اُن کو اندھا کردیا کہ پیروں کی طرف نظر نہ کرسکے۔ اُس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے خیال سے ہراساں ہوئے (۱) اور عرض کیا یا رسول اللہ اگر یہ لوگ اپنے

(۱) پریشان۔

پیروں کی طرف نظر کرنے لگیں تو ہم کو دیکھ لیں گے۔ حضور ﷺ نے نہایت استقلال سے جواب دیا: ''لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا''(۱)

وفی الصحیح انه قال ایضاً ماظنك باثنین اللّٰه ثالثهما (۲)

اسی طرح حضرت صہیبؓ کا بھی کفار نے تعاقب کیا تھا۔ حضرت صہیبؓ نے فرمایا تم جانتے ہو کہ میں نہایت اعلیٰ درجہ کا تیرانداز ہوں اور دیکھ رہے ہو کہ میری بغل میں ترکش تیروں سے بھرا ہوا موجود ہے اگر تم نے مقابلہ کے لئے قدم آگے بڑھایا تو یاد رکھنا ابھی تیروں سے مار مار کر سب کو یہیں ختم کر دوں گا۔ اس بات سے کفار کچھ مرعوب ہوئے اور چلتے چلتے ٹھہر گئے۔

حضرت صہیبؓ نے اب دوسری ترکیب سے کام لیا فرمایا اور اگر تم کو مال مطلوب ہے تو مکہ میں میرا مال بہت ہے لو میں تم کو پتہ بتلائے دیتا ہوں تم جا کر فلاں جگہ سے مال نکالو۔ آپ نے محض تخویف پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ سلاح طمع (۳) سے بھی کام لیا۔ چنانچہ یہ سن کر کفار لوٹ گئے۔ اور حضرت صہیب اطمینان کے ساتھ مدینہ پہنچے۔ حضور ﷺ سے آ کر قصہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ربح البیع ابا یحییٰ'' اس پر یہ آیت نازل ہوئی اس واقعہ سے بعض مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں ''یَشْرِیْ نَفْسَہٗ'' سے خریدنا مراد ہے۔ کیونکہ حضرت صہیب نے اپنے نفس کی بیع کہاں کی تھی بلکہ تخویف واطماع (۴) کے ذریعہ سے اپنی جان کو بچایا تھا اور بچانا گویا خریدنا ہے۔

حقیقت نفس

اور اس تفسیر پر ایک اشکال بھی ہوتا ہے کہ حضرت صہیب نے اپنی جان

(۱) ''آپ غم نہ کریں بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں'' (۲) کشف الخفاء للعجلونی: ۱/۳۲۳ (۳) لالچی طبیعت (۴) بلکہ خوف کی بنا پر مال کا لالچ دیکر بچایا تھا۔

کیوں بچائی۔ عاشق کو تو ایسا نہ چاہئے بلکہ عاشق کو تو جان دینا چاہئے۔ یہ اشکال متقشفین (صوفیاءِ خشک) کو ہوا ہے جو نفس کے دشمن ہیں نہ عمدہ غذائیں کھاتے ہیں نہ ٹھنڈا پانی پیتے ہیں۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ یہ نفس کافر ہے اس کو مارنا چاہئے۔ اے صاحب اللہ کے واسطے نفس کو کافر نہ کہئے۔ آپ کو معلوم بھی ہے نفس کون ہے یہ آپ ہی تو ہیں کیونکہ نفس آپ کی ذات بعض حیثیات سے ہے تو گویا آپ خود کو کافر کہتے ہیں اپنے ہی اوپر حملہ کرتے ہیں۔

جیسے مولانا نے ایک شیر کا قصہ لکھا ہے کہ وہ جنگل میں سے شکار کر کے کھاتا تھا۔ نخچروں (۱) نے باہم کمیٹی کی، یہ کمیٹی کی رسم پہلے ہی سے چلی آ رہی ہے۔ مگر پہلے نخچروں نے کی تھی۔ اب سب ہی کرنے لگے تو یہ رائے پاس ہوئی کہ شیر سے کہنا چاہئے کہ یوں اچانک حملہ نہ کیا کرے۔ اس طرح تو سب کی زندگی تلخ رہتی ہے۔ بلکہ ہم خود اپنے میں سے ایک کو روزانہ اُس کے پاس بھیج دیا کریں گے، شیر نے منظور کرلیا۔ اب انہوں نے یہ کیا کہ روزانہ قرعہ ڈالتے جس کا نام نکل آتا اُس کو بھیج دیتے۔ ایک دن خرگوش کا نام نکلا اُس کو بھیجنا چاہے تو اُس نے انکار کر دیا۔ نخچروں نے کہا ارے ایسا غضب نہ کرنا ورنہ شیر غصہ ہو کر پھر وہی کرے گا جو پہلے کرتا تھا۔ خرگوش نے کہا میری بلا سے اگر وہ ایسا کرنے لگا تو بیش بریں نیست (۱) کہ مجھے کھالے گا۔ سو یہی تم بھی میرے لئے تجویز کر رہے ہو۔ نخچروں نے کہا کہ اگر تو خود نہ جائے گا تو ہم سب جبراً تجھے پہنچا کر آئیں گے۔ خرگوش نے دیکھا کہ انکار سے کام نہیں چلتا تو اُس نے کہا اچھا میں جاتا ہوں اور راستہ میں سوچنے لگا کہ کسی تدبیر سے اس شیر ہی کا پاپ کاٹنا چاہئے۔ راستہ میں اُسے ایک کنواں ملا اُسے دیکھ کر بڑا خوش ہوا اور دوڑا ہوا شیر کے پاس پہنچا۔ چونکہ آج بحث وتکرار میں معمول سے کچھ دیر ہوئی تھی۔ اس لئے شیر غصہ میں زمین کی خاک اڑا

(۱) جنگلی جانوروں نے اجلاس بلا کر آپس میں مشورہ کیا (۲) اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ مجھے کھا جائے گا۔

رہا تھا۔ پھر خرگوش کو آتا دیکھ کر غرّایا کہ آج اتنی دیر کیوں ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری نیتوں میں فساد آ گیا ہے۔ اس نے کہا۔ حضور میں تو آپ کو ایک اطلاع کرنے آیا ہوں اگر امن ہو تو عرض کروں، کہا کہہ کیا کہتا ہے۔ خرگوش نے کہا، حضور آپ کی سرحد میں ایک دوسرا شیر آ گیا ہے وہ کہتا ہے کہ تم راتب(۱) مجھے دیا کرو۔ اور کسی کو نہ دیا کرو۔ آج حضور کے حصہ میں ایک بڑا موٹا تازہ خرگوش آیا تھا۔ میں اُس کو اپنے ساتھ لا رہا تھا۔ دوسرے شیر نے اُس کو پکڑ لیا۔ میں دوڑا ہوا آپ کو اطلاع کرنے آیا ہوں کہ اگر آپ اپنے راتب کی خیر چاہتے ہو تو اس غنیم (۲) کو اپنی سرحد سے نکال دیجئے ورنہ آج سے راتب بند ہے۔ یہ دشمن کسی کو آپ تک نہ آنے دے گا۔ شیر کو یہ قصہ سن کر غصہ آ گیا اور کہا چل میرے ساتھ چل کر بتلا کہ وہ دوسرا شیر کہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ خرگوش ساتھ ہو گیا اور کنویں پر لا کر کھڑا کر دیا اور کہا حضور دیکھئے وہ اس کنویں میں رہتا ہے۔ شیر نے جو جھانک کر دیکھا تو پانی میں اپنا عکس نظر آیا اور اُس کے پاس ایک موٹا تازہ خرگوش بھی نظر آیا وہ اس خرگوش کا عکس تھا اور قاعدہ ہے کہ پانی میں ہر شے کا عکس بڑا نظر آیا کرتا ہے۔ خرگوش نے کہا حضور دیکھئے۔ یہ دوسرا خرگوش آپ کے واسطے بھیجا گیا تھا اس نے قبضہ کر لیا۔ شیر نے غصہ میں آ کر حملہ کیا۔ اور دھڑام سے کنویں کے اندر پہنچا۔ خرگوش کچھ دیر ٹھہرا جب دیکھا کہ شیر غوطے کھانے لگا تو کہا حضور! بس میرا اسلام لیجئے۔ اور آپ یہیں آرام کیجئے۔

مولانا اس حکایت کو بیان کر کے فرماتے ہیں ؎

حملہ برخود می کنی اے سادہ مرد   ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد(۳)

اور جیسے ایک احمق بڈھے کی حکایت ہے کہ اُس کے بچہ کا روٹی کا ٹکڑا لوٹے میں جا پڑا، اس نے جھانک کر دیکھا کہ پانی میں اپنی صورت نظر آئی وہ سمجھا

(۱) کھانا (۲) دشمن (۳) ''اے بے وقوف تو اپنے اوپر خود ہی حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا''۔

کہ اس میں کوئی دوسرا بچہ ہے۔ جس نے میرا ٹکڑا چھین لیا ہے۔ اس نے بڑھے باپ سے کہا کہ ابا اس نے میرا ٹکڑا چھین لیا ہے۔ کہا کس نے، کہا کہ یہ جو لوٹے کے اندر بیٹھا ہے۔ بڑھے میاں نے اُٹھ کر دیکھا تو آپ کو لوٹے میں اپنی صورت نظر آئی تو اُس کو خطاب کر کے فرماتے ہیں تف ہے تیری اوقات پر۔ اتنی بڑی سفید داڑھی لگا کر بچہ کا ٹکڑا چھینتے شرم نہ آئی۔ اور جیسے ایک حبشی کی حکایت ہے کہ اس کو راستہ میں ایک آئینہ پڑا ہوا ملا۔ آپ نے اسے اٹھا کر جو دیکھا تو اُس میں اپنی ڈراؤنی صورت نظر آئی، جھلا کر پھینک دیا اور کہا ایسا بدصورت تھا جبھی تو کوئی تجھے پھینک گیا ہے۔ تو جس طرح یہ لوگ حقیقت میں اپنے آپ کو بُرا بھلا کہہ رہے ہیں۔ اور اپنے ہی اوپر حملہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح نفس کو کافر کہہ کر آپ ہی اپنے کو کافر کہہ رہے ہیں۔

حقوق وحظوظ

بھائی ہمارا نفس تو کافر نہیں بلکہ بحمداللہ مومن ہے گو گنہگار ہے، تو نفس کو کافر کہنا اور اس کو اس طرح مارنا مناسب نہیں، مگر بہت زیادہ بھی نہ کھایئے گو بعض جاہلوں، صوفیوں نے زیادہ کھانے میں بھی تاویل کی ہے۔ ایک سجادہ نشین بہت کھایا کرتا تھا۔ مٹھائیوں اور نذرانوں سے بدن خوب پھول گیا اور توند نکل آئی کسی نے اُس کو نصیحت کی صوفی لوگ تو زیادہ نہیں کھایا کرتے، تم کیسے صوفی ہو کہ کھا کھا کر اتنے پھول گئے ہو تو وہ کہتا کہ یہ بات نہیں بلکہ میرے پھولنے کی وجہ یہ ہے کہ میرا نفس مر گیا ہے اور نفس کتا ہے اور کتا مر کر پھول جاتا ہے۔ اس لئے پیٹ پھول گیا تو اس نے کہا حضور کتا جب پھول جاتا ہے تو اُس کو کوڑے پر ڈال آتے ہیں، پھر آپ اس پھولے کتے کو گھوارہ میں لے کر کیوں سوتے ہیں۔ یہ تو کوڑے

پر ڈالنے کے قابل ہے۔ خوب جواب دیا، پس نہ تو بہت کھاؤ اور نہ نفس کو مارو۔ بلکہ اعتدال کا لحاظ رکھو۔ جس کا فیصلہ محققین نے خوب کیا ہے، وہ یہ کہ ایک تو نفس کے حقوق ہیں اور ایک حظوظ ہیں (۱)۔ حقوق کو تو ضائع نہ کرو اور حظوظ کے درپے نہ ہو۔

جمعیت قلب

اور حقوق کے ضائع کرنے کی جو شریعت نے ممانعت کی ہے اُس کا ایک راز ہے جو حاجی صاحب کے پاس رہنے سے معلوم ہوا۔ حضرت کی زبان پر یہ لفظ بہت آیا کرتا تھا کہ جمعیت قلب کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ حضرت کو ہر بات میں اس کا بہت اہتمام رہتا تھا کہ قلب کی جمعیت فوت نہ ہو اس لئے حضرت کو تعلقات سے بہت نفرت تھی اور صوفیاء کے اقوال واحوال میں کبھی غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلق مع اللہ پیدا ہونے کے لئے جمعیت قلب (۲) بہت ضروری ہے۔ جمعیت قلب جیسا کہ زیادہ کھانے سے فوت ہوتی ہے۔ کم کھانے سے بھی فوت ہوتی ہے، زیادہ کھانے سے خطرات کا ہجوم ہوتا ہے کیونکہ معدہ کی تبخیر دماغ کی طرف صعود (۳) کرتی ہے۔ تو دماغ پریشان ہوجاتا ہے اور کم کھانے سے ہر وقت روٹیوں کی طرف دھیان لگا رہتا ہے۔ تو اس کی عبادت بھی ناقص ہوگی۔ رسالہ مکیہ میں لکھا ہے کہ عبادت کا کمال تشبہ بالملائکہ ہے یعنی آدمی فرشتوں کے مشابہ بن کر عبادت کرے اور فرشتوں کے مشابہ وہ شخص ہوگا جو نہ تو بہت کھانے کی وجہ سے ڈکاریں لے رہا ہو، نہ کم کھانے کی وجہ سے کھانے کو یاد کر رہا ہو۔ غرض جیسے کسل طعام تشبہ بالملائکہ (۴) کے خلاف ہے ایسے ہی تشویش جوع بھی اس تشبہ کے خلاف ہے (۵)۔ فرشتوں کے مشابہ وہ شخص ہے جو حالت اعتدال میں مشغول عبادت ہو۔

اس لئے شریعت نے حظوظ نفس میں سے تو اعلیٰ درجات الحظوظ (۶) سے روکا ہے

---

(۱) لذتیں (۲) دل کی یکسوئی (۳) چڑھتی ہے (۴) جیسے کھانے میں زیادتی مشابہت ملائکہ کے خلاف ہے (۵) بھوک کی پریشانی بھی اس مشابہت کے خلاف ہے (۶) لذتوں کے اعلیٰ درجات کو حاصل کرنے سے روکا ہے۔

اور حقوق نفس کی رعایت کا امر کیا ہے۔ (۱)

محبت منعم

اور یہاں سے معلوم ہوا ہوگا کہ شریعت سراسر مغز ہے جاہل صوفی اس کو قشر (۲) سمجھتے ہیں، مگر درحقیقت وہی قشر ہیں۔ محققین سے اس کی قدر پوچھو۔ اور حظوظ کی ممانعت بھی جب ہے جبکہ وہ حظ نفس کے طور پر استعمال کئے جائیں۔ مطلقاً ممانعت نہیں بلکہ ایک درجہ حظوظ کا بھی مطلوب ہے وہ یہ کہ اس لئے حظوظ کا استعمال کیا جائے تا کہ منعم سے محبت بڑھے۔ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ نے میرا نام لے کر فرمایا تھا کہ میاں اشرف علی پانی جب پیو خوب ٹھنڈا پیو۔ بال بال سے الحمد للہ نکلے گا، یہ راز تھا اس تعلیم میں تا کہ حق تعالیٰ کی نعمت کا شکر پوری طرح ادا ہو پھر منعم سے محبت زیادہ ہو۔ یہاں سے حضور ﷺ کے افعال کا مغز ہونا معلوم ہوتا ہے آپ ﷺ کو ٹھنڈے پانی سے رغبت کیوں تھی۔

حدیث (۳) میں آیا ہے کہ آپ ﷺ کے لئے ٹھنڈا پانی تلاش کر کے لایا جاتا تھا۔ کوئی متقشف صوفی (۴) تو اس کو سن کر یہ کہے گا کہ حضور ﷺ نے جو ابوالہیثمؓ صحابی کے یہاں ٹھنڈے پانی کی درخواست کی تھی۔ یہ کیسا مجاہدہ تھا مگر اس میں راز یہ تھا کہ منعم کی محبت بڑھے۔ گرم پانی پی کر تو صرف زبان ہی سے تو الحمد للہ نکلے گا باقی اعضا شریک نہ ہوں گے اور ٹھنڈا پانی پی کر جذر قلب (۵) سے بلکہ رگ رگ سے الحمد للہ نکلتا ہے۔

شاید کوئی یہ کہے کہ ہم ایسا مجاہدہ کریں گے کہ گرم پانی بھی ٹھنڈا ہی معلوم ہوگا اور گرم پانی پی کر بھی رگ رگ سے الحمد للہ نکلے گا تو میں کہوں گا کہ یہ بھی اس کی

(۱) حکم دیا ہے (۲) چھلکا (۳) مجمع الزوائد: ۱۰/۲۳۱، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۹/۲۳۴، کنز العمال: ۲۱۳۲۴
(۴) کوئی زاہدانہ مشقت آمیز ندگی گذارنے والا صوفی (۵) دل کی گہرائی۔

برکت ہے کہ وہ تم کو ٹھنڈا لگنے لگا تو زیادت محبت میں اب بھی ٹھنڈے کو ہی دخل ہے۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ نہیں ہم کو وہ گرم ہی لگتا ہے مگر ہمارے نزدیک گرم اور ٹھنڈا برابر ہوگیا ہے تو میں کہوں گا کہ جس کے منہ کا ذائقہ خراب ہوجاتا اس کا یہ حال ہوتا ہے اور یہ کچھ کمال نہیں۔ بلکہ نقص ہے کمال یہ ہے کہ حواس بشریہ سب درست رہیں اور پھر کمالات حاصل ہوں۔ ورنہ کافور کھا کر بے حس بن جانا کیا کمال کی بات ہے۔ صاحبو! جو لوگ اس نیت سے حظوظ کا استعمال کرتے ہیں کہ اُن سے منعم کی محبت زیادہ ہوگی، اُس کو کھانے میں انوار کا احساس ہوتا ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب انگور وغیرہ سب چیزیں جو ہدیہ میں آتی کھاتے تھے۔ اور یہ فرماتے تھے کہ جب کوئی شخص محبت سے ہدیہ لاتا ہے تو اُس کو کھا کر قلب میں ایک نور پیدا ہوتا ہے۔ سبحان اللہ! کیا شان ہے کہ انگور کھا رہے ہیں اور نور پیدا ہو رہا ہے قافیہ بھی مل گیا۔

حاجی صاحب کے کلام پر تو شاید آپ کو شبہ ہوا ہوگا۔ کہ یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ انگور سے نور پیدا ہو۔ کیونکہ حاجی صاحب نے اس کی دلیل نہیں بیان فرمائی۔ لیجئے میں آپ کو اس کی دلیل مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں دکھلا دوں۔ اُن کے علم کے تو سب قائل ہیں۔ ایک بار مولانا کے لئے ایک شخص گاڑھے کی ٹوپی لایا جس پر شال باف (۱) کی گوٹ لگی ہوئی تھی اور کہا حضرت فلاں شخص نے یہ ٹوپی آپ کے لئے بھیجی ہے۔ مولانا نے اُسی وقت اپنی قیمتی ٹوپی سر سے اُتار کر فوراً وہ گاڑھے کی ٹوپی اوڑھ لی۔ پھر جب قاصد چلا گیا تو آپ نے گاڑھے کی ٹوپی اتار کر کسی کو دیدی۔ اور اپنی پہلی ٹوپی پھر اوڑھ لی۔ ایک خادم نے پوچھا کہ حضرت جب اس کو رکھنا منظور نہ تھا تو آپ نے اوڑھی ہی کیوں تھی۔ فرمایا اس لئے اوڑھ لی تھی تا کہ یہ قاصد جا کر مہدی (۲) کو اطلاع کرے کہ تمہارے ہدیہ کی قدر کی گئی۔ تیری بھیجی ہوئی ٹوپی فوراً

(۱) جس پر اونی کپڑے کی گوٹ لگی ہوئی تھی (۲) ہدیہ بھیجنے والے کو بتادے۔

سر پر رکھ لی گئی۔ اس سے مہدی خوش ہوگا اور تطییب قلب مومن طاعت ہے اسی طرح جب ہدیہ کا انگور کھایا مُہدی کا دل خوش ہوا تو کھانے والے نے طاعت کی۔ اس کے ساتھ ایک مقدمہ بدیہیہ اور ملا لیجئے کہ طاعت سے قلب میں نور پیدا ہوتا ہے جس پر دلائل شرعیہ شاہد ہیں۔ پس لیجئے دلیل سے حاجی صاحب کا دعویٰ ثابت ہوگیا۔

اخفاء کاملین

دوسرا راز نعماء کے استعمال میں ہے کہ اس سے شہرت نہیں ہوتی۔ جب لوگ اس کو لذائذ ونعم کھاتے ہوئے دیکھیں گے یوں کہیں گے کہ یہ کیسے بزرگ ہیں جو عمدہ کھانے کھاتے ہیں تو اس سے ایک گونہ حالت کا اخفاء رہتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لو کہ کاملین اخفاء کا بھی زیادہ اہتمام نہیں کرتے کیونکہ اس اہتمامِ اخفاء سے بھی شہرت ہوجاتی ہے۔

چنانچہ جنگل میں جا کر بیٹھو تو میلہ لگ جائے گا۔ چلہ کشی کرو اور عزلت (۱) اختیار کرو، تو مخلوق کا ہجوم ہوجائے گا۔ اس لئے اخفاء کا زیادہ اہتمام بھی طلب شہرت میں داخل ہے۔ صائب کہتا ہے ؎

اگر شہرت ہوس داری اسیرِ دام عزلت شو — کہ در پرواز دارو گوشہ گیری نام عنقارا (۲)

اس لئے کاملین ایسا اخفا بھی نہیں کرتے جس سے شہرت ہو کیونکہ اصل چیز بچنے کی یہی شہرت تھی جو ایک بلاء ہے جس کی بابت مولانا فرماتے ہیں:

تن قفس شکل است اما خارِ جاں — از فریب داخلاں و خار جاں

انیش گوید نے منم ہمرازتو — آتش گوید نے منم انبازِ نو

او چو بیند خلق را سرمست خویش — از تکبر می رود از دستِ خویش (۳)

(۱) تنہائی (۲) ''اگر تم کو شہرت کی تمنا ہے تو گوشہ تنہائی کے دام میں اسیر ہوجاؤ کیونکہ گوشہ گیری کی وجہ سے نام عنقا ہوگیا'' (۳) ''تن قفس کے مثل ہے اسی وجہ سے وہ جان اور روح کے لئے مثل خار کے ہورہا ہے ایک اس کو کہہ رہا ہے میں آپ کا ہمراز ہوں دوسرا کہتا ہے نہیں صاحب میں آپ کا شریک حال ہوں وہ شخص بے چارہ جب ایک مخلوق کو اپنا سرمست اور عاشق دیکھتا ہے بس تکبر کی وجہ سے ہاشیوں نکل جاتا ہے''۔

آگے شہرت سے بچنے کا امر فرماتے ہیں ؎

خویش را رنجور ساز و زار زار تا ترا بیروں کنند از اشتہار
اشتہار خلق بند محکم است بند ایں از بند آہن کے کم است (۱)

آگے فرماتے ہیں کہ شہرت سے بعض معاصرین کو حسد بھی ہو جاتا ہے۔

چشمہا و خشمہا در شکمہا برسرت ریزد چو آب از مشکہا (۲)

مگر یہ شہرت مذمومہ (۳) وہ ہے جو طلب سے حاصل کی جائے اور جو بدوں طلب بلکہ باوجود طلب عدم کے حاصل ہو وہ بلا نہیں ہے۔ حق تعالیٰ اس میں اعانت فرماتے ہیں اور غوائل سے محفوظ رکھتے ہیں۔ بہرحال کاملین اعتدال کے ساتھ اپنی حالت کا اخفاء کرتے ہیں۔ اس لئے بھی نعمتیں کھاتے ہیں۔

حکایت

حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے کہ ایک بڑھیا نے اپنے لڑکے کو آپ کے حوالہ کیا کہ اس کو اپنی خدمت میں رکھئے وہ یہ سمجھی ہوگی کہ حضرت کے یہاں ہدایہ بہت آتے ہیں۔ میرا لڑکا کھا کھا کر خوب تیار ہو جائے گا۔ مگر چند روز کے بعد دیکھا کہ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ دُبلا تھا اور معلوم ہوا کہ اُس کو جَو کی دو روٹیاں صبح و شام ملتی ہیں۔ پہلے تو اُس کو خیال ہوا کہ شاید حضرت کے یہاں آج کل فتوحات (۴) کم ہوگئی ہوں گی۔ اس لئے میرے بیٹے کو عمدہ غذائیں نہیں ملیں۔ مگر جب وہ حضرت کے پاس آئی تو دیکھا کہ آپ مرغ کھا رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر جھلا ہی تو گئی اور کہا حضرت یہ کیا مروت ہے کہ آپ تو مرغ کھائیں۔ اور میرے بیٹے کو جَو کی روٹیاں دیں۔ حضرت نے فرمایا کہ بی تیرا بیٹا ابھی مرغ کھانے کے قابل

(۱) اپنے آپ کو رنجور اور گمنام رکھو تا کہ لوگ تم کو شہرت سے باز رکھیں۔ مخلوق کی شہرت اللہ اور ان کے بندہ کے درمیان مضبوط بند ہے، یہ بند لوہے کے بند سے کیا کم ہے" (۲) "غصہ اور آنکھیں اور اشک تیرے سر پر اس طرح ٹپکتے ہیں جس طرح مَشکوں سے پانی ٹپکتا ہے" (۳) بری شہرت (۴) ہدیئے کم آرہے ہونگے۔

نہیں ہوا۔ اُس نے کہا کیوں کیا میرے بیٹے کو کھانا نہیں آتا۔ آپ نے فرمایا ٹھہر جا۔ ابھی بتلاتا ہوں جب آپ کھانا کھا چکے تو مرغ کی ہڈیوں کو جمع کر کے فرمایا۔ قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہ قدرت خداوندی سے اُسی وقت وہ زندہ ہوگیا اور پَر جھاڑ کر چلتا پھرتا نظر آیا۔ حضرت غوث اعظم نے فرمایا کہ جب تیرا بیٹا ایسا ہو جائے گا۔ اُس وقت وہ بھی مرغ کھایا کرے گا۔ یہ جواب تو آپ نے بڑھیا کی عقل کے موافق دیا۔ کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِھِمْ ’’لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق کلام کرو‘‘ کے قاعدے پر۔

عکس نعمائے جنت

اور حقیقی جواب یہ تھا کہ بڑھیا کے بیٹے کو نعمتوں میں حظ نفس حاصل ہوتا(۱) اور حضرت کو حظ نفس مطلوب نہ تھا۔ (۲) بلکہ وہ نعمتیں اس لئے کھاتے تھے کہ اُن کو نعمائے جنت کا عکس (۳) ان میں نظر آتا تھا۔ اُس راز کو فقہاء نے بھی سمجھا ہے۔ چنانچہ صاحب ہدایہ نے مردوں کے لئے چار انگشت حریر کی اجازت کی علت یہ لکھی ہے۔

لتکون انموذجاً لحریر الجنّۃ تاکہ وہ حریر جنت کا نمونہ بن کر سامنے رہے۔ اور اس سے نعماء جنت کی رغبت ہو اور اسی لئے تو حق تعالیٰ نے قرآن میں جا بجا جنت کا ذکر فرمایا ہے تاکہ اُن کو سن کر جنت کی رغبت اور اعمال صالحہ کی ہمت ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے: ﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِیْهَاۤ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّی﴾ (۴)

---

(۱) نعمتوں کے استعمال میں نفس کو مزہ آتا (۲) حضرت کو نفس کا مزہ مطلوب نہیں تھا (۳) جنتی نعمتوں کا پرتو اس میں آتا تھا (۴) ’’جس جنت کا متقیوں سے وعدہ کیا جاتا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں بہت سی نہریں تو ایسے پانی کی ہیں جس میں ذرا تغیر نہیں ہوگا، اور بہت سی نہریں دودھ کی ہیں جن کا ذائقہ ذرا بدلا ہوا نہ ہوگا اور بہت سی نہریں شراب کی ہیں جو پینے والوں کو بہت لذیذ معلوم ہوگی اور بہت سی نہریں ہیں شہد کی جو بالکل صاف ہوگا‘‘ سورۃ محمد: ۱۵۔

کہیں حوروں کا ذکر ہے کہیں پھل پھلواری کا بیان ہے کہیں نہروں کا تذکرہ ہے۔ اسی لئے تاکہ ان کی رغبت سے اعمال کا شوق پیدا ہو۔ پس کاملین اس لئے بھی نعمتیں کھاتے ہیں۔ تاکہ نعماء[1] جنت ہر وقت یاد رہیں۔

لطفیہ

نہروں کے ذکر پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ جب میں ڈھاکہ گیا تو وہاں کھانے میں گھی بہت ہوتا تھا۔ میں نے کہا (اتنا گھی مت ڈالا کرو، میں اتنا گھی نہیں کھا سکتا) تو نواب صاحب کے ایک عزیز کہنے لگے کہ ہم تو آپ کی وجہ سے گھی بہت کم ڈالتے ہیں ورنہ ہمارے یہاں تو سیر بھر گوشت میں سیر بھر گھی ڈالا جاتا ہے۔ میں نے کہا ہمارے یہاں تو اتنا گھی جانوروں کو دیا کرتے ہیں۔ جب بیل منزل چل کر آتے ہیں تو آدھ سیر یا سیر بھر گھی نال[2] میں بھر کر اُن کو پلایا جاتا ہے۔ آدمی تو اتنا گھی کبھی نہیں کھاتے اور قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ گھی انسانوں کے لئے کوئی زیادہ مرغوب شئے نہیں۔ کہنے لگے صاحب! قرآن سے کیونکر معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ حق تعالیٰ نے جنت کے اندر نہریں بتلائی ہیں ایک پانی کی، ایک دودھ کی ایک شراب کی، ایک شہد کی اگر گھی مرغوب شئے ہوتا تو جنت میں ایک نہر گھی کی بھی ضرور ہوتی ہے۔ مگر گھی کی نہر کوئی بھی نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی مرغوب شئے نہیں۔ یہ تو درمیان میں ایک لطیفہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ کاملین دنیا کی نعمتوں کو نعماء آخرت کا نمونہ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں۔

نمونہ

مگر یہ شرط ہے کہ نمونہ نمونہ کے طور پر ہو۔ ویسا نمونہ نہ ہو جیسا کہ

(۱) جنت کی نعمتیں (۲) نالی۔

ہمارے ایک دوست نے بیان کیا تھا کہ وہ اور اُن کے ایک ساتھی ریل میں سوار تھے۔ اناوَ(۱) کے سٹیشن پر جب پہنچے۔ تو ہم نے وہاں کے پیڑے خریدنا چاہے۔ کیونکہ اناؤ کے پیڑے مشہور ہیں تو ریل میں ایک اور صاحب سوار تھے۔ وہ کہنے لگے۔ کہ صاحب میں نے یہ دو بڑے پیڑے خریدے ہیں پہلے آپ ان کو چکھ لیجئے۔ اس کے بعد اگر اچھے لگیں تو خرید لیجئے گا ورنہ نہیں۔ کیونکہ اب یہاں کے پیڑے پہلے جیسے نہیں رہے۔ تو میرے ساتھی نے یہ حرکت کی کہ چھکنے کے واسطے ایک سالم پیڑا اٹھالیا۔ تو اس مسافر نے دوسرا میرے سامنے کر دیا۔ کہ یہ آپ چکھ لیجئے۔ اُس کی اُس بات سے مجھ پر ایسی ندامت سوار ہوئی۔ کہ تمام راستہ آنکھ اوپر کو نہ اٹھی۔ اور اب بھی جب کبھی اُن کا سامنا ہوجاتا ہے۔ شرماجاتا ہوں۔ اور جیسے انبہٹہ میں ایک صاحب شکر لینے دکان پر گئے اور چادر پھیلا دیا اور دکاندار سے کہا کہ پہلے ہم کو شکر کا نمونہ دکھلاؤ۔ وہ چادر پھیلی ہوئی دیکھ کر یہ سمجھا کہ شاید چار پانچ روپیہ کی خریدیں گے۔ اُس نے سکوری بھر کر نمونہ کی دکھلائی۔ آپ نے چکھ چکھ کر ساری سکوری ختم کر دی اور کہا بہت عمدہ ہے ایک پیسہ کی دیدو، دکان دار جھلا گیا کہ سبحان اللہ! چار پیسہ کی شکر تو آپ نمونہ ہی میں کھا گئے اب ایک پیسہ کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تو صاحبو! یہ کیا خاک نمونہ ہے جو اصل سے بھی بڑھ گیا۔ پس نمونہ کے طور پر نعمتیں کھانے کا یہ مطلب نہیں کہ رات دن اسی میں منہمک ہوجائے اور کھانے کے نشہ میں نمازیں بھی جماعت سے نہ پڑھے۔

ترک لذائذ

باقی جن لوگوں نے ترک نعماء اور تقلیل لذائذ کیا ہے(۲) اُن پر اعتراض بھی نہ کیا جائے۔ کیونکہ ترک لذائذ مطلقاً رہبانیت نہیں۔ بلکہ جو اس کو عبادت سمجھے وہ راہب ہے اور اگر عبادت نہ سمجھے بلکہ علاج سمجھ کر ترک کرے وہ راہب نہیں۔

(۱) جگہ کا نام (۲) جن لوگوں نے اللہ کی نعمتوں کو ترک کیا یا ان میں کمی کی ہے۔

آج کل میں نے ایک ماہ سے گوشت نہیں کھایا۔ کیونکہ پیر میں درد کی وجہ سے اطباء نے منع کر رکھا ہے تو کیا مجھے بھی راہب کہو گے۔ اسی طرح سمجھ لو کہ جن بزرگوں نے لذائذ کو ترک کیا ہے۔ انہوں نے عبادات یا ثواب سمجھ کر ترک نہیں کیا۔ بلکہ علاج اور دوا سمجھ کر ترک کیا ہے۔ سو اس کا اب بھی مضائقہ نہیں۔ اگر کسی کو اصلاح مزاج(۱) کے لئے اس کی ضرورت ہو وہ ترک کرسکتا ہے۔ مگر تم اپنی رائے سے نہ چھوڑو بلکہ کسی شیخ سے پہلے پوچھو۔ اور کسی ایک کو اپنا بڑا بنالو۔ اور اس کے ساتھ یہ برتاؤ رکھو ؎

دلا رامے کہ داری دل داروبند دگر چشم از ہمہ عالم فروبند(۲)

اور یہ معاملہ کرو ؎

ہمہ شہر پُر ز خوباں منم وخیال ما ہے چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بکس نگاہے(۳)

میں یہ نہیں کہتا کہ تم اس سے بیعت ہو جاؤ۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ دین کا ہر کام اس کے مشورہ سے کرو۔

اطلاع واتباع

بس میں نے دو لفظوں میں معاملہ بالشیخ(۴) کا خلاصہ نکالا ہے اس کے موافق عمل کرنا چاہئے۔ یعنی اطلاع واتباع اپنے احوال کی اُسے اطلاع کرتے رہو اور جو وہ حکم دے اس کے موافق عمل کرو پھر میں بقسم اور پھر بقسم کہتا ہوں کہ ان شاء اللہ ایسا شخص ضرور کامیاب ہوگا۔ بلکہ اگر اس کو اس تمام مشقت کے بعد صرف یہی معلوم ہوا کہ میں ناکام رہا تو یہی کامیابی ہے کیونکہ اس نایافت(۵) سے عبدیت پیدا ہوگی اور یہی کمال مقصود ہے اسی کو کہتے ہیں ؎

(۱) طبیعت کی درستی کے لئے (۲) ''جس دل آرام یعنی محبوب سے تم نے دل لگایا ہے تو پھر تمام دنیا سے آنکھیں بند کرلو'' (۳) ''سارا شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے اور میں ایک چاند کے خیال میں مست ہوں کیا کروں کاش بدخوئی نظر کسی پر بھی نہ پڑی'' (۴) شیخ کے ساتھ برتاؤ کا خلاصہ نکالا ہے (۵) اس ناکامی سے۔

اريد وصـالـه ويـريد هجرى　　فـاتـرك مـا اريد لما يـريد (۱)

اور عارف کہتے ہیں ۔

میل من سوئے وصال و میل اوسوے فراق　　ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست (۲)

اور جامی کہتے ہیں ۔

ہمینم بس کہ داند ماہر ویم　　کہ من نیز از خریدارانِ اویم (۳)

حضرت حاجی صاحب سے جب کوئی شکایت کرتا کہ حضرت ذکر سے کچھ نفع نہیں ہوا تو فرماتے ہیں یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم محبوب کو یاد کررہے ہو پھر یہ شعر پڑھتے ۔

یا بم اور ایانہ یا بم جستجوئے میکنم　　حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم (۴)

جو شخص شیخ کی تعلیم پر عمل کرتا رہے گا اُس کو اور کچھ بھی نہ ملے تو رضا تو ملے گی۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا وعدہ ہے﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ﴾(۵) اور ظاہر ہے کہ یہ ہدایت اراۃ طریق نہیں ہے(۶) کیونکہ اُس میں مجاہدہ شرط نہیں ہے۔ بلکہ ایصال الی المطلوب ہے۔(۷) اور مطلوب ہے رضا۔ پس رضا کا ملنا ثابت ہوگیا۔ اور اصل مطلوب یہی ہے۔

قطع وساوس

پس اے سالکین جن چیزوں کی طلب میں تم رات دن رہتے ہو یعنی

(۱)''میں اسکا وصال چاہتا ہوں اور وہ مجھے چھوڑنا چاہتا ہے پس میں نے اپنا ارادہ اس کے ارادہ کی بناء پر چھوڑ دیا'' (۲)''میرا میلان اس سے ملنے پر ہے اور اس کا میلان فراق کی طرف ہے پس میں نے اپنا کام چھوڑ دیا تا کہ دوست کا کام بن جائے'' (۳)''یہی کافی ہے کہ میرا محبوب جان لے کہ میں اس کے خریداروں میں سے ہوں'' (۴) میں اسے پاؤں یا نہ پاؤں میں اس کی جستجو کرتا ہوں مجھے حاصل ہو یا نہ ہو میں آرزو کرتا ہوں'' (۵)''جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو قرب وثواب یعنی جنت کے راستے ضرور دکھلائیں گے'' سورۃ العنکبوت:۶۹ (۶) راستہ دکھانے کا نام نہیں (۷) مطلوب تک پہنچانے کا نام ہے۔

حالات وکیفیات، ذوق وشوق وغیرہ بتلاؤ ان کا وعدہ شریعت میں کہاں ہے نہ یہ اختیاری امور ہیں، نہ طلب پر ان کے ترتب کا وعدہ ہے پھر تم ان کے پیچھے کیوں پڑتے ہو۔ اور اگر تم ان کو اختیاری سمجھتے ہو تو پھر ان کے حاصل نہ ہونے کی شکایت کیوں ہے۔ بسم اللہ حاصل کرو ہم بھی تو دیکھیں کہ تم اختیار سے ان کو کیونکر حاصل کرتے ہو۔

صاحبو! یہ کون سی حدیث میں آیا ہے کہ نماز سے کیفیت وجد یہ اور صوم سے فناء میلان الی المعاصی اور ذکر سے عدم وسوسہ کا ترتب ضرور ہوگا(۱) اور چونکہ وسوسہ یا اس کا ازالہ اختیاری نہیں اسی لئے حدیث میں وسوسہ قطع کرنے کی کوئی تدبیر بھی نہیں آئی۔ اور جو کچھ اس باب میں آیا ہے وہ قطع وسوسہ کی تدبیر نہیں ہے بلکہ اُس کا حاصل صرف دوامر ہیں(۲)۔ ایک یہ کہ وساوس کے آنے سے خوش ہو۔ دوسرے یہ کہ ان کی طرف التفات نہ کرے(۳)۔ چنانچہ ایک جگہ حضور ﷺ نے صحابہ کے جواب میں یہ فرمایا ہے۔ الحمد للّٰہ الذی رد کیدہ الی الوسوسۃ(۴)

اور فرمایا ہے ذاك صریح الایمان(۵) یہ تو خوش ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اور ایک حدیث میں یہ آیا ہے کہ جب شیطان اس قسم کا وسوسہ ڈالے۔

فلیستعذ باللّٰہ ثم لینتہ۔ اعوذ باللّٰہ پڑھ دے اور وسوسہ سے باز رہے، یہ عدمِ التفات ہے اور دونوں میں مشترک بھی ہے کہ اُس کے دفع کا اہتمام نہ کرے۔

اور بعض علماء جو اس کے یہ معنی کرتے ہیں کہ وسوسہ سے رُک جائے۔ گویا اس کو دفع وسوسہ کی تدبیر سمجھے سو یہ صحیح نہیں کیونکہ وسوسہ کا روکنا اختیاری امر نہیں۔

(۱) یہ کب کہا ہے کہ نماز سے وجد کی کیفیت ہوگی اور روزہ سے گناہوں کی طرف میلان نہ ہوگا اور ذکر کرنے سے وسوسے نہیں اُٹھیں گے (۲) صرف دو باتیں ہیں (۳) توجہ نہ کرے (۴) ''سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے اس کے مکروفریب کو وسوسہ میں تبدیل کردیا'' الصحیح لمسلم کتاب البر والصلۃ: ۱۱۵، مسند أحمد: ۲/۲۴۴، فتح الباری: ۱۱/۳ (۵) یہ تو صریح ایمان ہے۔

صاحب وسوسہ تو خود ہی اس سے پریشان ہورہا ہے اُس کو یہ حکم کیونکر ہوسکتا ہے کہ وسوسہ کو روک دے۔ صحیح مطلب اس کا صوفیاء نے سمجھا ہے وہ کہتے ہیں کہ فلینتہ کے معنی یہ ہیں۔ فلا یلتفت الیہ یعنی اس کی طرف التفات نہ کرے۔ اور التفات نہ کرنا یہ ہے کہ جلباً التفات کرے نہ سلباً۔ یعنی نہ اس کو مستحضر کرے اور نہ دفع کرے۔ بلکہ یہ بھی نہ دیکھے کہ وسوسہ گیا یا نہیں۔ کیونکہ یہ بھی ایک درجہ کا التفات ہے۔

صاحبو! محققین نے جو کچھ کہا ہے وہ سب نصوص سے ثابت ہے۔ مگر نص میں اجمال ہوتا ہے وہ اپنے اجتہاد سے اس کی تفصیل کر دیتے ہیں اور یہ کوئی جرم نہیں۔ آخر فقہاء بھی تو احادیث احکام ظاہرہ کو قیاس سے مفصل کرتے ہیں، پس محققین کا یہ فرمانا کہ نہ جلباً التفات کرے نہ سلباً۔ اسی حدیث فلیستعذ باللّٰہ ثم لینتہ (تعوذ پڑھیے اور وسوسہ سے باز رہیئے) کی تفصیل ہے۔

وساوس سے بچنے کی تدبیر

اس کے بعد محققین نے ایک بے التفاتی وعدمِ توجہ کے متعلق ایک اور بات بتلائی ہے وہ یہ کہ وسوسہ سے پوری بے توجہی اُس وقت تک نہیں ہوسکتی۔ جب تک نفس کو کسی اور شئے کی طرف متوجہ نہ کیا جائے۔ اس لئے اسکی بھی ضرورت ہے کہ وسوسہ سے توجہ ہٹا کر کسی اور شئے کی طرف متوجہ ہوجائے چاہے کعبہ کا تصور کرلے یا مدینہ کا یا کسی علمی مضمون کا یا اخیر میں بچا کچھا یہ شیخ رہ گیا ہے۔ اس کا تصور کرلے اس سے بھی وسوسہ کی طرف بے توجہی ہوجاتی ہے۔

تصور شیخ

اور مسئلہ تصور شیخ کا یہی حاصل ہے۔ مگر بعض نے اس کو قبلہ وکعبہ اور مقصود ہی

بنالیا ہے۔ اسی کو مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ منع فرماتے ہیں(۱)۔ ورنہ مطلقاً تصور شیخ کو وہ منع نہیں کرتے جب کہ محض اس لئے تصور کیا جائے تاکہ نفس کی توجہ وسوسہ سے ہٹ جائے اور اس کے لئے کچھ تصور شیخ ہی کی ضرورت نہیں۔ بلکہ جس چیز کا بھی تصور کرلیا جائے کافی ہے کیونکہ مقصود تو یہ ہے کہ نفس کی توجہ دوسری طرف مشغول ہوکر وسوسہ سے ہٹ جائے۔لان النفس لا تتوجه الیٰ شیئین فی اٰن واحد(۲)۔

اس کیلئے ایک طفل گہوارہ (۳) کا بھی تصور کافی ہے بلکہ شاید وہ تصور شیخ سے زیادہ نافع ہو۔ کیونکہ وہ پاک اور معصوم ہے اور شیخ تھوڑے سے گنہگار بھی ہیں۔ گومُرید سے زیادہ نہیں، مُرید کو یہی سمجھنا چاہئے کہ شیخ میرے برابر گنہگار نہیں گو واقع میں وہ اس سے بھی زیادہ ہو۔ مگر مُرید کو اسی خیال سے نفع ہوگا اور اگر کسی کے بچہ نہ ہو تو وہ اپنے گائے بیل یا بھینس ہی کا تصور کرلے۔ چنانچہ ایک بزرگ نے اپنے مرید کو اسی کا شغل کرایا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ مُرید کے قلب میں بہت چیزوں کے تعلقات بھرے ہوئے ہیں تو پوچھا کہ بھائی تم کو کسی چیز سے محبت بھی ہے۔ اُس نے کہا جی ہاں! بھینس سے محبت ہے۔ فرمایا جاؤ چالیس روز تک اسی کا تصور کرتے رہو۔ وہ بے چارہ اسی کا

---

(۱) احقر ناران کے سفر سے واپسی پر بالاکوٹ میں ایک رات کیلئے دریائے کنہار کے کنارے واقع ایک ہوٹل میں قیام پذیر ہوا صبح بعد فجر اس وعظ پر حاشیہ لکھ رہا تھا کہ سید اسماعیل شہید کا یہ مقولہ پڑھا تو بالاکوٹ میں ان کی جہادی خدمات کا تصور کر کے خیال ہوا کہ انہی اکابرین کی ساعی جمیلہ کی بنا پر پاکستان آزاد ہوا۔ دریا کے دوسری طرف نظر پڑی تو دیکھا وہاں، ان کے شیخ سید احمد شہید کا مزار ہے ناشتہ کے بعد اس کی زیارت کو گیا اور ایصال ثواب کیا۔ شاہ اسماعیل شہید ۱۲ ربیع الثانی ۱۹۱۳ء پیدا ہوئے ۸ سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا ۱۶ سال کی عمر میں علومِ دینیہ کی تحصیل مکمل کی اس کے بعد فنون حرب کو سیکھا، ۱۸۱۶ء میں سید احمد شہید سے بیعت ہوئے اور ان کی سرپرستی میں سکھوں اور انگریزوں کے خلاف جہاد کیا بروز جمعہ گیارہ بارہ بجے کے درمیان مئی ۱۸۱۶ء میں جام شہادت نوش فرمایا۔ سید احمد شہید رحمہ اللہ کے ولد سید محمد عرفان ۶ صفر ۱۲۰۴ھ/ ۲۹ پیر ۱۷۸۲ء کو پیدا ہوئے سید صاحب کا سلسلہ نسب ۳۶ واسطوں سے حضرت علی کرم اللہ وجہ سے ملتا ہے ۶ مئی ۱۸۳۱ء گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان بالاکوٹ میں جام شہادت نوش فرمایا۔ (خلیل ۱۰ محرم الحرام ۱۴۳۸ھ) (۲) ’’نفس کی توجہ ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف نہیں ہوسکتی‘‘ (۳) بچے کے پنگھوڑے کا تصور۔

تصور کرتا رہا جب چلہ پورا ہوگیا، تو شیخ خود اس کے پاس گئے کیونکہ وہ اس میں ایسا مستغرق ہوگیا تھا کہ دن پورے ہونے کی بھی خبر نہ رہی۔ شیخ نے حجرہ پر جا کر آواز دی کہ بھائی باہر نکلو پس چلہ پورا ہوگیا وہ نکلا اور دروازہ پر آکر کھڑا ہوگیا۔ شیخ نے کہا باہر آؤ تو وہ کہتا ہے کیونکر آؤں سینگ اٹکتے ہیں وہ بالکل ہی فنا فی البھینس (۱) ہوگیا تھا۔ شیخ نے ہاتھ پکڑا اور کہا اب نکل آؤ ہم نے سینگ کو نکال دیا ہے۔

اس پر شاید اہلِ ظاہر کو اعتراض ہوگا کہ یہ کیسا مراقبہ تھا مگر یاد رکھو طُرق میں محققین (۲) پر اعتراض کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ علوم میں جتنا چاہو کلام کرلو اور وہ بھی محققین پر نہیں ہوسکتا۔

طریق اصلاح کا حاصل

کیونکہ محققین جو کچھ کہتے ہیں۔ واللہ شریعت کے موافق کہتے ہیں۔ صاحبو! ان بزرگ نے وہ کیا ہے جو رات دن آپ خود کرتے ہیں۔ بلکہ ایک ایک جاہل بھنگن بھی وہی کرتی ہے۔ جو انہوں نے کیا۔ اگر آپ بھنگن سے یہ کہیں کہ گھر کوڑے کباڑ سے صاف کردے تو بتلایئے وہ کیا کرے گی۔ آیا ہر تنکے کو الگ الگ باہر پھینک کر آئے گی یا جھاڑو سے سارے کوڑے کو ایک جگہ جمع کرکے ٹوکرے میں بھر کر پھینکے گی، ظاہر ہے کہ وہ اوّل جھاڑو سے سارے کوڑے کو اکٹھا کرے گی اسی طرح یہاں سمجھئے کہ وہ بھینس کا تصور ایک جھاڑو تھی۔ جس نے تمام تعلقات کو سمیٹ لیا وہ عصائے موسیٰ علیہ السلام تھا جس نے سب سانپوں کو نگل لیا۔ بس اب صرف یہ ایک رہ گیا (۳)۔ شیخ نے اپنی توجہ سے یا اشغال واذکار کے ذریعہ سے اس کو

(۱) وہ مکمل طور پر بھینس کے تصور میں کھو گیا (۲) طریقہ اصلاح میں محققین پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا (۳) یعنی بھینس کا تصور باقی سب تصورات فنا ہوگئے پھر شیخ نے اس کو بھی اشغال کے ذریعہ فنا کردیا۔

بھی دل سے نکال دیا۔ بتلائیے اس میں کیا خرابی ہوئی۔ (یہاں پہنچ کر حضرت کو ربط یاد نہ رہا۔ اس لئے ٹھہر گئے اور کاتب سے ربط دریافت فرما کر ارشاد فرمایا)

نگاہِ قلب کی حالت

بس یاد آ گیا میں یہ کہہ رہا تھا کہ قطع وسوسہ کی کوئی تدبیر حدیث میں نہیں آتی یعنی ایسی تدبیر جس کے بعد وسوسہ آئے ہی نہیں۔ بلکہ حضور ﷺ نے ایسی تدبیر بتلائی ہے کہ اگر وسوسہ آئے بھی تو پریشانی نہ ہو اور وہ عدمِ التفات ہے (۱) اس پر میں نے کہا تھا کہ عدم التفات کے بعد یہ بھی نہ دیکھو کہ وسوسہ گیا نہیں یہ بھی التفات ہے (۲) بلکہ مجاہدہ کے بعد بھی اگر وساوس موجود ہوں تو پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ نگاہ قلب کی وہ حالت ہے جو نگاہ بصر کی حالت ہے (۳) اگر تم کسی شخص کے سامنے چند نقطے بنا کر یہ کہو کہ ان میں سے صرف ایک ایک کو دیکھو تو گو اس کا قصد ایک ہی دیکھنے کا ہوگا۔ مگر بلا قصد خود بخود (۴) اور بھی نظر آئیں گے۔ تو کیا دوسروں کے نظر آنے سے اُس ایک نقطہ کے دیکھنے میں اس کو نا کام کہا جائے گا، ہرگز نہیں اسی طرح شعاع قلب (۵) کی حالت ہے کہ ایک شے کی طرف متوجہ ہونے سے دوسری اشیاء خود بخود سامنے آجاتی ہیں (۶)۔ اس سے پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ غرضیکہ قطع وسوسہ اور ذوق وشوق اور کیفیات واحوال یا ترک لذات یہ کچھ مقصود نہیں۔ مقصود رضا ہے جس کے طرق میں شیخ کا اتباع شرط ہے۔ وہ اگر لذات کی بھی اجازت دے تو وہ منافی رضا نہیں۔ کیونکہ میں بتلا چکا ہوں کہ حظوظ کا بھی ایک درجہ مطلوب ہے (۷) پس جب حظوظِ نفس (۸) کی رعایت بھی مطلقاً مذموم نہیں تو حفاظت نفس مطلقاً کیسے

---

(۱) وہ یہی وسوسہ کی طرف توجہ نہ کرنا ہے (۲) یہ بھی وسوسہ کی طرف توجہ ہے (۳) کیونکہ دل کی نگاہ ایسی ہی ہے جیسے آنکھ کی نگاہ (۴) بلا ارادہ دوسرے نقطوں پر بھی نظر پڑے گی (۵) دل کی شعاعوں کا حال ہے (۶) ایک چیز کی طرف توجہ کرنے سے دوسری کی طرف خود بخود توجہ ہوتی ہے (۷) لذتوں کا ایک درجہ مطلوب ہے (۸) خواہشاتِ نفس۔

مذموم ہوجائے گی۔ اب حضرت صہیب کے واقعہ پر سے اشکال رفع ہوگیا(۱)۔

حقیقت عشق

دوسرے یہ کہ یہاں مقصود اشتراء نفس من حیث النفس نہ تھا۔ بلکہ باامر حق تھا(۲)۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ عاشق کو جان دینا چاہئے بچانا نہ چاہئے یہ مطلقاً صحیح نہیں عاشق کے بذلِ نفس کی حقیقت وہ ہے جس کو ایک شاعر کہتا ہے ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن ‌ ‌ دل بدست دگرے دادن وحیراں بودن (۳)

پس عاشقی نام بندگی کا ہے کہ ہر وقت حکم کا تابع رہے جہاں جان دینے کا حکم ہو وہاں جان دے اور جہاں بچانے کا حکم ہو وہاں بچائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ عشق کی حقیقت تفویض ہے کہ اپنے کو خدا تعالیٰ کے سپرد کردے وہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں، تشریعاً بھی اور تکویناً بھی اور یہ ہر حال میں راضی رہے، یہ حقیقت ہے تفویض کی جس کی ابتداء شیخ کے ہاتھ میں اپنے کو تفویض کرنے سے ہوتی ہے۔

اشکال کا جواب

اس پر شاید کسی کو شُبہ ہو کہ تفویض جب خالص حق، اللہ تعالیٰ کا ہے تو شیخ کے ہاتھ تفویض کرنا غیر اللہ کو حق دینا ہے، جواب یہ ہے کہ چونکہ یہ تفویض مطلوب کا مقدمہ ہے۔ اس لئے تفویض الی الشیخ تفویض الی غیر الحق نہیں ہے(۴)، اور اسی تعلق خاص کی بناء پر کبھی قوم کے کلام میں یہ تعبیر بھی پائی جاتی ہے کہ شیخ غیر حق نہیں اگر اس پر سوال ہو کہ پھر کیا شیخ عین حق ہے اور صوفیاء پر ایک اعتراض اس سے بڑھ

(۱) یہ واقعہ شان نزول عنوان کے تحت مذکور ہے (۲) یہاں اپنے جان کو بچانے کے لئے یہ بیع نہیں تھی بلکہ اس وقت خدا کا حکم تھا کہ جان بچانے کے لئے بیع وشراء کی جائے (۳) ’’عاشقی کیا ہے محبوب کا غلام بن جانا اپنا دل دوسرے کے ہاتھ میں دے دینا اور خود حیران رہ جانا‘‘ (۴) اپنے کو شیخ کے سپرد کردینا غیر اللہ کے سپرد کرنا نہیں ہے

کر ہوا ہے کہ یہ ہر چیز کو عین حق کہہ دیتے ہیں۔ سو میں اس کی حقیقت بھی بتلاتا ہوں۔ دراصل یہ صوفیاء کی اصطلاح ہے جس سے وہ معنی مراد نہیں جو اہل علم کے نزدیک متبادر ہوتے ہیں ۔

اصطلاحاتے ست مر ابدال را(۱)

مذاق العارفین

رہا یہ اشکال کہ یہ اصطلاح تو خلافِ شرع ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح تو نحو کی اصطلاحات بھی تو خلاف شرع ہیں، کیونکہ حدیث میں آتا ہے "الف" حرف "لام" حرف "م" حرفٌ ۔مگر نحویوں سے پوچھو تو وہ ان کو اسماء کہتے ہیں تو کیا خشک مولوی اُن پر بھی کفر کا فتویٰ لگا دیں گے۔ حضور ﷺ تو ان کو حروف فرماتے ہیں۔ اور یہ لوگ آپ کی خلاف اصطلاح مقرر کرکے ان کو اسم کہہ رہیں ہیں، سو ہر شخص سمجھتا ہے کہ اس میں کفر کی کوئی بات نہیں نحوی اپنی اصطلاح کے موافق ان کو کہہ رہا ہے اور حضور ﷺ نے محاورہ کے موافق اُن کو حروف فرمایا ہے کیونکہ محاورہ میں حرف کلمہ کو کہتے ہیں جو اسم وفعل وغیرہ سب کو عام ہے۔ ہمارے یہاں بھی تو حرف عام ہے چنانچہ معلم بچہ سے قرآن میں پوچھا کرتے ہیں۔ کہ ''یعلمون'' سے آگے کیا حرف ہے حالانکہ اُس سے آگے نحوی حرف ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ ممکن ہے کہ اصطلاح نحو کے موافق اس کے آگے اسم ہو تو جس طرح حضور ﷺ نے اس حدیث میں محاورہ کے موافق خلاف اصطلاح اہل نحو کے کلام فرمایا ہے۔

اسی طرح صوفیاء نے بھی عالم کو یا شیخ کو خلاف اصطلاح اہل علم محاورہ کے موافق عین حق فرمایا ہے کیونکہ محاورہ میں عین کہتے ہیں، متعلق غیر اجنبی کو۔ چنانچہ ایک دوست دوسرے سے کہا کرتا ہے کہ ہم تم غیر تھوڑا ہی ہیں ہم اور تم تو ایک ہی

(۱) میری اصطلاحات جدا ہیں۔

ہیں۔ کہئے اس کا کیا مطلب ہے کیا اس سے عینیت مطلقہ مراد ہوتی ہے(۱)۔ ہرگز نہیں بلکہ مطلب وہی ہے کہ تم اجنبی نہیں ہو اپنے ہی آدمی ہو۔

اسی طرح صوفیاء رسول کو اور شیخ کو کبھی عالم کو اس معنی کر عین حق کہتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ سے اجنبی نہیں ہیں، بلکہ اُس کے ساتھ علاقہ رکھنے والے ہیں، اور وہ علاقہ رسول اور شیخ میں تو ایصال کا(۲) ہے۔ اور عالم میں مظہریت (۳) کا بھی ہے یہ جواب میں نے مولوی اسحاق کانپوری کو دیا تھا۔ انہوں نے'' لاالٰہ الا اللّٰہ '' کے متعلق یہ اشکال کیا تھا کہ ضیاء القلوب میں حاجی صاحب نے لکھا ہے کہ لا الٰہ میں یہ تصور کرے کہ غیر حق کو دل سے (۴) نکال دیا۔ مولوی صاحب نے پوچھا تھا کہ غیر حق میں تو رسول اللہ ﷺ بھی داخل ہیں تو کیا نعوذ باللہ! آپ کو بھی دل سے نکال دے۔ میں نے یہی کہا تھا کہ غیر سے جو مراد ہے۔ اس معنی کر آپ غیر حق نہیں (۵)۔ جیسا ابھی مذکور ہوا۔

اعضاء کی قدر

اور رسول اللہ ﷺ تو بڑی چیز ہیں۔ سالک تو جس وقت یہ دیکھتا ہے کہ ہمارے اعضاء نے قُرب حق میں ہماری اعانت کی ہے(۶)۔ وہ اس حیثیت سے اُن سے محبت کرتا ہے۔ وہ اپنی آنکھ کی بھی رعایت کرتا ہے۔ اور دماغ کی بھی حفاظت کرتا ہے۔ نہ اس واسطے کہ یہ اپنی چیزیں ہیں بلکہ اس واسطے کہ یہ خدا تعالیٰ کی چیزیں ہیں اور جو لوگ ان کو اپنی چیزیں سمجھتے ہیں اُن کا دوسرا برتاؤ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک قصہ ہے۔

(۱) کیا اس سے لازم آتا ہے کہ دونوں کا جسم وجاں ایک ہے (۲) شیخ اور رسول کے ذریعہ ہی آدمی اللہ تک پہنچ سکتا ہے (۳) عالم اللہ کی صفت علم کا مظہر ہے (۴) اللہ کے سوا سب کو دل سے نکالدیا (۵) اس معنی کے اعتبار سے آپ غیر حق ہیں ہی نہیں (۶) ہمارے ہاتھ پیر نے بذریعہ عبادت اللہ کا قرب حاصل کرنے میں ہماری مدد کی ہے۔

زاہدے را گفت یارے در عمل کم گری تا چشم را ناید خلل
گفت زاہد از دو بیروں نیست حال چشم بیند یا نہ بیند آں جمال
گر بہ بیند نورِ حق راچہ غم ست در وصال حق دو دیدہ کے کم ست
ورنہ بیند نور حق را گو برو ایں چنیں چشم شقی گو کور شو(۱)

یہ زاہدوں کا مذاق ہے اور پہلا عارفین کا مذاق ہے جس کا ماخذ یہ حدیث ہے۔ ''انّ لنفسك عليك حقّا وانّ لعينك حقا (۲)

جس کو ایک عارف اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

نازم بچشم خود کو جمالِ تو دیدہ است اُفتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہردم ہزار بوسۂ زنم دستِ خویش را کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است (۳)

کلامِ حق برزبانِ سالک

اور اسی کو حضرت غوثِ اعظم اس طرح فرماتے ہیں ؎

شکر اللہ کہ نمردیم ورسیدیم بدوست آفریں باد بریں ہمت مردانۂ ما(۴)

ظاہر بیں کی نظر میں (۵) اس پر یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ یہ تو اپنی تعریف ہونے لگی۔ مگر میں تو یہ کہوں گا ارے تم کیا جانو آخر شجرۂ طور نے جو کہا تھا۔

(۱) ''کسی نے ایک زاہد سے کہا کہ کم رویا کرو تا کہ آنکھیں نہ جاتی رہیں۔ زاہد نے کہا کہ سنو آنکھ یا تو وہ جمال دیکھے گی یا نہیں دیکھے گی اور دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی پرواہ نہ کی جائے اور اگر وہ جمال دیکھے گی تو وصال حق کے مقابلہ میں دونوں آنکھوں کی کیا پرواہ۔ اور اگر جمال حق نظر نہ آئے تو ایسی کم بخت آنکھوں کو لے کر کیا کرو گے۔ ان کا اندھا ہونا ہی بہتر ہے'' (۲) ''بیشک تیری جان کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھ کا بھی تجھ پر حق ہے'' (۳) ''مجھے اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ انہوں نے تیرا جمال دیکھا ہے اور اپنے پیروں پر رشک کرتا ہوں کہ وہ تیرے کوچہ میں پہنچے ہیں میں اپنے ہاتھوں کو ہزار مرتبہ بوسہ دیتا ہوں کہ ان سے تیرا دامن پکڑ کر اپنی طرف کھینچا ہے'' (۴) اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم خیریت سے دوست تک پہنچ گئے ہماری اس ہمت مردانہ پر آفرین'' (۵) ظاہری نگاہ رکھنے والے کی نظر میں اس پر اشکال ہے۔

اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۱) کیا یہ اُس نے خود کہا تھا اور منصور نے انا الحق (۲) کہا تھا کیا وہ خود کہہ رہے تھے نہیں۔ بلکہ منصور مجبور تھے جیسے شجرۂ طور مجبور تھا۔ گو منصور کامل نہ تھے جیسے شجرہ کامل نہ تھا۔ کامل موسیٰ علیہ السلام تھے انہوں نے ایک دن بھی اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ نہیں کہا اسی طرح کامل حضرت جنید اور حضرت غوث اعظم تھے۔ انہوں نے انا الحق کبھی نہیں کہا، حضرت غوث اعظم کا ارشاد ہے کہ منصور کی کسی نے مدد نہیں کی وہ ایک ورطہ (۳) میں گرفتار تھے۔ اگر میں اس زمانہ میں ہوتا تو اُس کو اس ورطۂ (۴) سے نکال دیتا۔ مگر یہ بات ضروری ہے کہ منصور نے انا الحق خود نہیں کہا تھا۔ بلکہ کوئی اُن سے کہلوا رہا تھا۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ الہام میں حق تعالیٰ کا کلام سالک کے قلب پر وارد ہوتا ہے اور بے ساختہ اُس کی زبان سے نکل جاتا ہے (۵)۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ متکلم ہے حالانکہ متکلم حقیقت میں حق تعالیٰ ہے۔ مگر کلام حق بدوں قصد و ارادہ (۶) کے اس کی زبان سے نکل رہا ہے۔

غیر حق نہ ہونے کا معنی

جیسا کہ غالباً احمد جام رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے کہ ان کی خدمت میں ایک مرد عورت اپنے لڑکے کو لائے جو کہ اندھا تھا اور آ کر عرض کیا حضرت ہمارے یہی ایک لڑکا ہے جو قسمت سے اندھا ہے اس کو سوانکھا کر دیجئے (۷)۔ آپ نے فرمایا کیا میں عیسیٰ ہوں جو اندھوں کو سوانکھا کر دوں (۸) وہ بے چارے چپکے ہی لوٹ (۹) چلے تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ آپ نے فرمایا "ما کُنیم ما کُنیم" (۱۰) اور اُن کو واپس

(۱) "بے شک میں اللہ سارے جہانوں کا پروردگار ہوں" (۲) میں اللہ ہوں (۳) ایک پریشانی میں مبتلاء تھا (۴) پریشانی (۵) سالک کے دل پر اللہ کا کلام وارد ہوتا ہے اور بالفاظ اس کی زبان سے ظاہر ہو جاتا ہے (۶) سچی بات بغیر اس کے ارادے کے زبان سے نکلتی ہے (۷) اس کی بینائی لوٹا دیجئے (۸) کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بطور معجزہ مادر زاد اندھے کو بینا کر دیتے تھے (۹) خاموشی سے واپس چلے گئے (۱۰) میں بینا کرتا ہوں میں بینا کرتا ہوں۔

کرنے کا حکم دیا۔ خدام نے اُن کو واپس بلایا۔ آپ نے لڑکے کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور دُعا کی فوراً بینا ہوگیا۔ بعد میں خدام نے عرض کیا کہ حضرت یہ کیا بات تھی کہ آپ نے اول تو انکار کیا اور یہ فرمایا کہ کیا میں عیسیٰ ہوں۔ اور بعد میں اتنا بڑا دعویٰ کیا کہ ''ما کنیم ما کنیم'' فرمایا کہ ''ما کنیم'' میں نے نہیں کہا تھا بات یہ ہے کہ جب میں نے یہ کہا کہ میں کیا عیسیٰ ہوں تو حق تعالیٰ نے عتاب فرمایا کہ سبحان اللہ کیا آپ عیسیٰ علیہ السلام کو مؤثر سمجھتے ہیں بلکہ اُس وقت بھی ہم ہی کرتے تھے اور ہم اب بھی موجود ہیں۔ پس ''ما کنیم ما کنیم'' دراصل حق تعالیٰ کا کلام تھا جو بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔ اسی طرح حضرت غوث اعظم سے جو بعض دعوے منقول ہیں۔ وہ سب بامرِ حق تھے یہ باتیں ان کی زبان سے حق تعالیٰ کے حکم سے نکلی ہیں وہ خود نہیں کہہ رہے تھے اسی لئے وہ فرماتے ہیں ؎

شکر للہ کہ نمردیم ورسیدیم بدست آفریں باد بریں ہمت مردانۂ ما(۱)

جب سالک تعلق بالحق کے سبب اپنے اعضاء اور اپنی ذات کو خدا کا سمجھنے لگتا ہے۔ تو پھر رسول اللہ ﷺ کو خدا کا کیوں نہ سمجھیں گے۔ یہ معنی ہیں آپ کے غیر حق نہ ہونے کے اور اسی درجہ میں نفس کی حفاظت بھی مطلوب ہوگی کیونکہ وہ نفس من حیث ہی نفس کی حفاظت نہیں۔(۲) بلکہ اس حیثیت سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے کہ وہ خدا کی چیز ہے اور خدا تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا امر فرمایا ہے۔

شراء نفس

اس لئے ''مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِیْ نَفسه''۔(۳) میں شراء کی اشتراء نفس

---

(۱) ''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم خیریت سے دوست تک پہنچ گئے ہماری اس ہمت مردانہ پر آفریں'' (۲) کیونکہ جان کی حفاظت جان ہونے کے اعتبار سے نہیں کی جارہی بلکہ اللہ کی امانت ہونے کی بنا پر کی جاتی ہے (۳) ''اور بعض آدمی اپنی جان تک صرف کر ڈالتا ہے''۔

کے ساتھ تفسیر کرنے پر بھی کچھ اشکال نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ اشتراء لاجل الاذخار(۱) نہ تھا بلکہ ''لاجل البیع من اللہ '' تھا۔(۲) دوسری تفسیر یہ کہ ''یَشْرِیْ'' سے مراد بیع ہے۔ اس پر یہ سوال ہوگا کہ یہ تفسیر تو واقعہ نزول کے خلاف ہے۔ صہیبؓ نے اپنے نفس کو بیع کہاں کیا تھا۔ بلکہ بچایا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ گو دماں صورۃً بیع نہ تھی۔ مگر نیت بیع ہی کی تھی (۳) کیونکہ حضرت صہیبؓ اس لئے تیار ہو کر نکلے تھے کہ اگر بذلِ نفس کی نوبت آئے گی تو اس سے بھی دریغ نہ ہوگا(۴) اس کی نوبت نہیں آئی۔ مگر الاعمال بالنّیات (۵) کے قاعدہ سے یہ شتراء بحکم بیع ہی ہے۔

اسی لئے حضور ﷺ نے یہ قصہ سن کر فرمایا ''ربع البیع ابا یحییٰ ''(۶) کہ صہیبؓ اس بیع میں ملک الموت (۷) سے جیت گئے۔

ملک الموت کا نام اور اسکی وجہ

ابو یحییٰ ملک الموت کا لقب ہے (۸) اور واقعی یہ لقب عمدہ ہے ابو یموت لقب نہیں رکھا۔(۹) ہم سے اس کی وجہ پوچھو تو ہم تو یہ کہیں گے کہ جس کو تم موت کہتے ہو۔ حقیقت میں حیات (۱۰) وہی ہے کیونکہ وہ لقاء حق کا وسیلہ ہے(۱۱)۔ اور لغت کے اعتبار سے یہ بھی ممکن ہے کہ ابو یحییٰ اس لئے کہا گیا ہو کہ ملک الموت کے فعل قبض روح کا تعلق ذی حیات (۱۲) سے ہوتا ہے کیونکہ موت تو زندہ ہی کو آتی ہے۔ مردہ کو نہیں آیا کرتی یا اور کوئی وجہ ہو لغت پر میری نظر نہیں ہے۔ مطلب جیتنے کا

(۱) یہ خریدنا اس کو محفوظ کرنے کے لئے نہیں تھا (۲) بلکہ اللہ کے ہاتھ فروخت کرنے کی غرض سے تھا (۳) وہاں خرید و فروخت کی شکل نہیں تھی لیکن نیت بیچنے ہی کی تھی (۴) اگر جان دینے کا موقع آیا تو اس سے بھی گریز نہیں کرینگے (۵) اعمال کا مدار نیت پر ہے (۶) تاریخ بغداد للخطیب: ۷/۵۷ (۷) موت کا فرشتہ (۸) موت کے فرشتے کا نام زندگی والا ہے (۹) موت والا نام نہیں رکھا (۱۰) حقیقی زندگی (۱۱) اللہ سے ملاقات کا ذریعہ ہے (۱۲) ابو یحییٰ نام رکھنے کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ زندہ لوگوں کی روح نکالتا ہے۔

یہ ہے کہ صہیبؓ نے ملک الموت کو جان نہ دی۔ بلکہ خدا تعالیٰ کے حوالہ کردی۔ اگر ملک الموت کے حوالہ کرتے تو اتنا نفع نہ ہوتا(۱) اور خدا تعالیٰ کے حوالہ کرنے سے یہ ملا۔

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد آنچہ در وہمت نیاید آں دہد
خود کہ یابد ایں چنیں بازار را کہ بیک گل می خری گلزار را(۲)

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ آپ نے بھی حضرت صہیبؓ کے فعل کو بیع قرار دیا ہے۔اس لئے یَشْرِیْ نَفْسَہٗ (اپنی جان صرف کرڈالتا ہے) کی تفسیر یبیع نفسہٗ (اپنی جان کی بیع) سے بھی صحیح ہے۔غرض حضرت صہیبؓ خدا تعالیٰ کے سپرد اپنی جان کو کر چکے تھے۔ یہ درجہ اعلیٰ ہے طلب کا۔

اشکال کا جواب

شاید کوئی یہ کہے کہ صاحب جان دینا تو بڑا مشکل کام ہے ایسا مشکل کام مامور بہٖ کیسے ہوسکتا ہے جان تو انسان کو ایسی پیاری ہے کہ ایک بڑھیا کی بیٹی بیمار ہوگئی تھی وہ روز دعا کیا کرتی کہ اے اللہ میری جان لے لی جائے میری بیٹی کی جان نہ لی جائے ایک دن اس کے گھر میں گائے اس صورت سے گھس آئی کہ اُس کے منہ میں ہنڈیا پھنسی ہوئی تھی بڑھیا یہ سمجھی کہ یہ موت ہے کیونکہ گائے کو اس ہیئت سے (۳) کبھی نہ دیکھا تھا۔اب وہ کیا کہتی ہے ؎

گفت اے موت من نہ مہستیم پیر زالِ غریب محنستیم (۴)

یہ دیکھ مہتی وہ پڑی ہے اُس کو لے لے۔ ایسی ہی کانپور میں ایک بڑھیا

(۱) فائدہ (۲) ''آدھی جان لیتے ہیں اور سینکڑوں جانیں عطا کرتے ہیں جو انسان کے خیال میں نہیں آتا وہ عطا کرتے ہیں تم ایسا بازار کہاں سے لاؤ گے کہ ایک پھول کے بدلے سارا گلزار خریدلو'' (۳) اس شکل وصورت میں (۴) ''اے موت میں مہستی نہیں ہوں مہستی تو وہ سامنے پلنگ پر پڑی ہے (یہ اُس کی بیٹی کا نام ہے) میں تو غریب بڑھیا ہوں''

کے لڑکے کو سرسام (۱) ہو کر غشی ہوگئی تھی۔ لوگ سمجھے کہ مر گیا ہے۔ کفن دفن کی فکر میں لگ گئے تھوڑی دیر میں اُس کو ہوش آ گیا۔ تو عورتوں نے یہ سمجھا کہ یہ مر کر بھوت ہوگیا ہے اب وہی ماں جو پہلے اس کی صحت کے لئے دعائیں کراتی تھی۔ جا بجا یہ کہتی پھرتی تھی کہ کوئی ایسا تعویذ کر دو کہ میرا بیٹا مر جاوے کیونکہ اب اس کو اپنی جان کا خطرہ ہوگیا تھا کہ دیکھئے یہ بھوت کیا کر ڈالے گا۔ اپنی جان آدمی کو ایسی عزیز ہے اور یہ جو کسی نے کہا ہے کہ ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست ورزر طلبی سخن دریں ست (۲)

یہ اُس نے بدوں دیکھے کہہ دیا ہے۔ اگر موت کو دیکھ لیتا تو ایسا ہرگز نہ کہتا۔ بھلا جو شخص مال نہیں دے سکتا۔ وہ جان کیا خاک دے گا۔

تفصیل تفویض

تو صاحب آپ گھبرائیے نہیں یہاں جان دینے سے مراد یہ نہیں ہے کہ آپ سچ مچ مر جائیں بلکہ جان دینا یہ ہے کہ انسان خود کسی چیز کا طالب نہ ہو۔ سوائے اُس کے جس کا خدا تعالیٰ نے امر (۳) فرمایا ہے جس کا مختصر عنوان تفویض ہے (۴) جس کے متعلق یہ آیت وارد ہوئی ہے۔

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾۔ (۵)

"اِحْسَان" کی تفسیر شرع میں اخلاص ہے پس بیع نفس سے مراد "اسلام وجہ" ہے کہ اپنی خواہش اور ارادہ کو خدا تعالیٰ کی خواہش اور ارادہ میں فنا کر دے۔ یہ

(۱) بیماری کا نام ہے۔ جس میں بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے (۲) "اگر جان مانگو کوئی حرج نہیں اور اگر نقدی طلب کرو کلام اسی میں ہے" (۳) سوائے اس کے جس کا اللہ نے حکم دیا ہو (۴) اپنے کو دوسرے کے سپرد کر دینا ہے (۵) "اور اُس شخص سے اچھی کس کی عبادت ہے، جو اپنی ذات کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے اس حال میں کہ وہ محسن ہو" سورۃ النساء: ۱۲۵۔

مضمون پہلے بھی بیان ہوا ہے۔ گو اس کا موقعہ یہاں نہ تھا، مگر کچھ حرج نہیں جہاں بھی بیان ہو جائے مفید ہے۔ مگر کچھ حصہ اس کا پہلے بیان ہونے سے رہ گیا تھا، اُس کو اب بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ تفویض میں ایک تفصیل ہے کیونکہ مطلوب سالک دو قسم کے ہیں بعض غیر اختیاری ہیں اور بعض اختیاری۔ اور غیر اختیاری کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو شرعاً بھی مطلوب ہیں اور ایک وہ شرعاً مطلوب نہیں۔ یہ کل تین قسمیں ہوئیں۔ پس ان میں سے امور اختیاریہ کا تو یہ حکم ہے کہ اُن کو عمل کر کے حاصل کرو۔ اور غیر اختیاری امور میں جو شرعاً غیر مطلوب ہیں اُن کا حکم یہ ہے کہ اُن کی طلب دل سے نکال دو اُن کے درپے نہ ہو۔

احضارِ قلب

اور جو غیر اختیاری شرعاً مطلوب ہیں اُس کے لئے دُعا کرو مثلاً احضار قلب نماز میں مامور بہ ہے(۱) اور یہ اختیاری ہے، پس اس کو تو عمل سے حاصل کرو۔ یاد رکھئے میں نے احضارِ قلب کہا ہے۔ اس کو حضور قلب نہ سمجھئے گا وہ اختیاری نہیں اور نہ اس کا مکلّف کیا گیا ہے۔(۲) بلکہ حکم اس کا ہے کہ تم اپنی طرف سے قلب کو حاضر رکھنے کی کوشش کرو۔ اس احضار قلب کی حقیقت اُن لوگوں سے پوچھو جو عمل کرتے ہیں۔ اُن سے نہ پوچھو جو ہر کام کو بدوں عمل ہی کے دشوار کہہ دیتے ہیں۔(۳)

مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار اس کی حقیقت یہ بیان فرمائی ہے کہ نماز فعلِ مرکب ہے جس کے مختلف اجزاء ہیں۔ قیام وقعود ورکوع وسجود اور قرأت واذکار وغیرہ

(۱) نماز کو دل کی توجہ سے پڑھنے کا حکم ہے کہ دل بھی نماز کی طرف متوجہ ہو کسی اور طرف مشغول نہ ہو (۲) دل کو حاضر کرنا کہا ہے کہ اپنے اختیار سے دل کو نماز کی طرف متوجہ رکھے۔ چاہے غیر اختیاری طور پر توجہ ہٹ بھی جائے مسلسل دل کا حاضر ہونا نہ سمجھا جائے کہ انسان کو اس کا پابند نہیں کیا گیا۔ (۳) بغیر عمل کے مشکل کہہ دیتے ہیں۔

پس احضار قلب یہ ہے کہ اس کے اعمال واقوال کو حفظ سے ادا نہ کرو۔ بلکہ ارادہ اور توجہ سے ادا کرو کہ اب زبان سے یہ نکال رہا ہوں۔ اب یہ لفظ کہہ رہا ہوں، اور اب رکوع میں جاتا ہوں۔ اب سجدہ کررہا ہوں ہر ہر فعل اور ہر لفظ پر جدید ارادہ کرو۔ اس طرح احضار قلب حاصل ہوجائے گا۔ مولانا کے اس ارشاد کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے۔

صلی رکعتین مقبلاً علیھما بقلبه (۱) اس میں ضمیر علیہما کا مرجع رکعتین یعنی صلوٰۃ ہے حاصل یہ ہوا کہ اپنے دل سے نماز پر متوجہ رہے اور وہ مرکب ہے تو اس پر توجہ واقبال وہی ہے جو مولانا نے بیان فرمایا یہ تو امر اختیاری ہے اس کو تو ہمت وعمل سے حاصل کرنا چاہئے۔ اور ایک ہے حضورِ قلب یہ اختیاری نہیں۔ یعنی اُس کا وہ درجہ اختیاری نہیں جس کی سالکین کو طمع ہے ورنہ جو درجہ حضور کا مطلوع احضار ہے (۲) وہ تو اختیاری ہے اس حضور زائد کے لئے صرف دعا کرنا چاہئے۔ اسی طرح ذوق وشوق وغیرہ بھی غیر اختیاری ہیں ان کے لئے بھی دعا کرنا چاہئے مجاہدہ وغیرہ اس کی تدبیر نہیں ہے۔ جیسا کہ حدیث میں اُن کے لئے صرف دُعا آئی ہے: ’’اَللّٰھم انی اسئلك شوقا الی لقائك‘‘ (۳) سو مجاہدہ وغیرہ حصول شوق کی غرض سے نہ کرو نہ شیخ سے اُس کے حصول کی تدبیر پوچھو نہ اس سے یہ شکایت کرو کہ ہمارے اندر شوق پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے لئے محض دعا کرو اور شیخ محقق کو چاہئے کہ اگر کوئی اس سے ان امور کے لئے تدبیر پوچھے تو صاف کہہ دے کہ ان کے حاصل ہونے کی کوئی تدابیر اختیاری نہیں ہے بس دعا کرو پھر دعا کر کے اس

---

(۱) مسند احمد رقم الحدیث: ۱۷۳۹۳ (۲) یعنی ارکان نماز کی ادائیگی کے وقت یہ خیال ہونا کہ اب فلاں رکن ادا کررہا ہوں جیسے اوپر ذکر کیا گیا (۳) مسند احمد: ۳۲۴/۵۔

کو بھی مت دیکھو کہ شوق حاصل ہوا یا نہیں کیونکہ تم کو کیا خبر ہے کہ تمہارے لئے کیا مناسب ہے ممکن ہے تمہارے لئے عدم شوق ہی مناسب ہو اس پر یہ شبہ نہ ہو کہ جب یہ امور شرعاً مطلوب ہیں تو ہمارے لئے ان کا نہ ہونا کیونکر مناسب ہوگا۔ کیونکہ مطلق مطلوبیت للکل لازم نہیں (۱) بعضوں کے لئے بعض مطلوبات بھی بہتر نہیں ہوتے۔ دیکھو صحت و عافیت شرعاً مطلوب ہے جس کے لئے حضور ﷺ نے خود بھی دعا فرمائی ہے اور امت کو بھی سوالِ عافیت کا امر فرمایا ہے: ''سلو الا اللّٰہ العافیة فانه ما سئل من اللّٰه شئی احب الیه من العافیة'' (۲)

مگر پھر بھی بعضوں کے لئے بیمار رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ نہ معلوم تندرست رہ کر وہ کیا ستم ڈھاتے۔ اسی طرح سوانکھا ہونا (۳) نعمت مطلوبہ ہے مگر بعض کے لئے اندھا ہونا ہی بہتر ہے۔ نہ معلوم آنکھیں ہوتیں تو وہ کتنی عورتوں کو گھورتا۔ پس معلوم ہوگیا کہ بعض مطلوبات (۴) بھی بعض کے لئے بہتر نہیں ہوتے۔ مگر یہ تقسیم مطلوب غیر اختیاری میں ہے مطلوب اختیاری میں یہ تفصیل نہیں وہ سب کے لئے بہتر ہیں جس کی دلیل شریعت کا امر ہے (۵) اگر وہ سب کے لئے بہتر نہ ہوتے تو سب کو اُن کا امر نہ ہوتا۔ خوب سمجھ لو۔ بہرحال حضور زائد اور کیفیات وجدیہ اور شوق و ذوق کے لئے دعا تو کرو (۶)۔ مگر دعا کے بعد اُن کے منتظر بن کر نہ بیٹھو۔ بلکہ اپنے کو خدا کے سپرد کرو کہ ہمارے لئے جو بہتر ہوگا ہو رہے گا۔ خواہ حصول ہو یا عدم حصول (۷)

(۱) ان کے مطلوب ہونے سے ہر ایک کے لئے ان کا مطلوب ہونا لازم نہیں آتا (۲) ''اللہ سے عافیت مانگو اس لئے کہ اللہ سے جن چیزوں کا سوال کیا جاتا ہے ان میں سب سے محبوب عافیت ہے'' مجمع الزوائد: ۱۰/ ۱۲۳۱، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۹/ ۲۳۴، کنز العمال: ۲۱۳۲۴ (۳) آنکھوں کی بینائی کا ہونا ایک نعمت پسندیدہ ہے (۴) جن چیزوں کے طلب کرنے کا حکم ہے (۵) شریعت کا حکم ہے (۶) نماز میں کمال حضور اور کیفیت جذب و شوق و ذوق کے لئے دُعاء تو کرنی چاہیے (۷) ہمارے لئے جو مناسب ہوگا ہو جائے گا حاصل ہو نہ ہو۔

آنکس کہ تو انگرت نمی گرداند　　او مصلحت تو از تو بہتر داند(۱)

اب اس تفصیل کے بعد شیخ سے کچھ مانگنے کا کسی کا منہ نہیں نہ شکایت کی گنجائش ہے کیونکہ جس چیز کو تم شیخ سے مانگو گے یا عدمِ حصول کی شکایت کرو گے اگر وہ شرعاً مطلوب نہیں ہے تو شیخ کہہ دے گا کہ اس خیال کو دل سے نکالو۔ اور اگر مطلوب ہے اور اختیاری ہے تو وہ کہے گا کہ عمل سے اس کو حاصل کرو۔ اور اگر مطلوب غیر اختیاری ہے تو وہ کہے گا کہ اس کے لئے تم بھی دُعا کرو ہم بھی دُعا کریں۔ مگر دعا کر کے اس کا انتظار نہ کرو کہ حصول ہوا یا نہیں بلکہ برابر دعا میں لگے رہو۔ اس پر شاید یہ سوال ہو کہ جب کچھ دنوں دعا کر کے مطلوب کا ظہور نہ ہوا تو یہ اس کی علامت ہوگی کہ اس مطلوب کے عطا میں حکمت نہیں، پھر اب آئندہ اس کے لئے دعا کی اجازت نہ ہونا چاہئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں دعا کی پھر بھی اجازت ہے کیونکہ اب تک عطا میں حکمت نہ تھی۔ تو یہ کیا ضروری ہے کہ آئندہ بھی عطا میں حکمت نہ ہو۔ اور دعا گو ظاہر میں مطلق ہے۔ مگر حقیقت میں مقید ہے۔ معنی یہ ہیں۔ ”اللّٰھم انی اسئلك شوقا ان کان لی خیر“(۲)

مگر چونکہ اپنے نزدیک یہ مطوب خیر ہی تھا اس لئے اِن شرطیہ کو حذف کر دیا گیا۔

عبدِ کامل

یہ حاصل ہے تفویض کا جس کی اس طریق میں سخت ضرورت ہے اسی کو عارف فرماتے ہیں ۔

فکر خود ورائے خود در عالم رندی نیست　　کفرست دریں مذہب خود بینی وخودرائی (۳)

(۱) ”جس نے تجھے دولت مند نہیں بنایا وہ تیری مصلحت تجھ سے بہتر جانتا ہے“ (۲) ”اے اللہ میں تجھ سے شوق کا سوال کرتا ہوں اگر وہ میرے حق میں خیر ہے“ مسند احمد :۲/۴۱۳، مجمع الزوائد:۱۰/۱۹۶، کنز العمال:۹/۱۱۷ (۳) ”اپنی رائے اور فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں اس راہ میں خود بینی اور خودرائی کفر ہے“۔

اس راستہ میں سالکین کو قبض وبسط (۱) وغیرہ بڑے بڑے حالات پیش آتے ہیں دل پر آرے چلتے ہیں مگر بجز تفویض کے کوئی تدبیر نہیں (۲)۔ ایسے ہی قبض شدید کی نسبت عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش
اے دل اندر بند زُلفش از پریشانی منال مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش (۳)

بعض نے اس حالت میں جان دے دی ہے کیونکہ قبض میں واردات بھی بند ہوجاتے ہیں اور انوار بھی بند کیفیات بھی بند، اس وقت تفویض ہی سے کام چلتا ہے جو شخص اس وقت بھی کام پر جما رہے اور کیفیات وانوار کے بند ہوجانے پر یوں کہے ؎

روزہا گر رفت گورو باک نیست تو بماں اے انکہ چوں تو پاک نیست (۴)

او یوں کہے ؎

میل من سوئے وصال ومیل اوسوئے فراق ترک کام خود گرفتم تا برآید کامِ دوست (۵)

وہ عبد کامل ہے وہ واقعی بڑا عارف ہے۔ شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے ہی موقع پر ایک عارف کا قول نقل فرمایا ہے ؎

توانی ازاں دل بہ پرداختن کہ دانی کہ بے اوتواں ساختن (۶)

(۱) سالک کو پیش آنے والی دو کیفیات ہیں۔ واردات کا انقطاع جو کسی مصلحت سے ہوتا ہے قبض ہے۔ اور اس کے مقابل حالت بسط کہلاتی ہے یعنی آثار لطف وفضل کے ورود سے قلب کو سرور وفرحت ہونا (۲) سوائے اس کے کہ اپنے کو اللہ کے سپرد کردے اور کوئی تدبیر نہیں ہے (۳) ''اے باغبان اگر پانچ روز بھی گل کی صحبت میسر آجائے تو جدائی کے کانٹوں کی تکالیف پر بلبل کو صبر آسکتا ہے۔ اے دل تو اس کی زلفوں میں گرفتار ہوکر پریشان مت ہو کیونکہ عقلمند پرندہ جب جال میں پھنستا ہے تو اسکو صبر کرنا چاہئے'' (۴) ''ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہئے اگر گئے بلا سے گئے عشق جو اصلی دولت ہے سب خرابیوں سے پاک وصاف ہے اس کا رہنا کافی ہے'' (۵) ''میرا میلان وصال کی طرف سے ہے اور میرے محبوب کا میلان فراق کی طرف ہے میں نے اپنا کام چھوڑ دیا تا کہ میرے دوست کا کام بن جائے'' (۶) ''اس سے دل کیسے خالی کرسکتے ہو جس کے بارے میں یقین ہو کہ اس کے بغیر گزارا، ناممکن ہے''۔

ان کو ایک رات غیب سے یہ آواز آئی تھی کہ جو چاہے کر یہاں کچھ قبول نہیں یہ آواز اُن کے ایک مرید نے بھی سن لی۔ عارف اگلے دن پھر رات کو لوٹا لے کر وضو کو چلے۔ مرید نے کہا ایسی بھی کیا بے غیرتی ہے کہ وہ تو دھکے دیتے ہیں قبول ہی نہیں کرتے اور آپ پھر بھی پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ جب وہ قبول نہیں کرتے تو آپ ہی اپنا آرام کیوں کھویا۔ پڑ کے سو رہیے، عارف نے جواب دیا ؎

بنو میدی انگہ بگردیدمے　　　ازیں رہ کہ راہے دگر دیدمے
چو خواہندہ محروم گشت ازدرے　　　چہ غم گر شناسد در دیگرے
شنیدم کہ راہم دریں کوئے نیست　　　ولے ہیچ راہے دگرروئے نیست
تو انی ازاں دل بہ پرداختن　　　کہ دانی کہ بے اوتواں ساختن (۱)

سبحان اللہ! کیا لاجواب جواب دیا اس پر معاً رحمت حق کو جوش آیا۔ جوش میں نے ویسے ہی کہہ دیا وہ اس سے پاک ہیں۔ مگر اب سمجھانے کو کیا کہیں کون سا لفظ اختیار کروں۔ غرض آواز آئی ؎

قبول ست گرچہ ہنر نیست　　　کہ جز ماپنا ہے دگر نیست (۲)

عارفین فرماتے ہیں کہ عارف اور مفوض کامل وہ ہے کہ اگر عمر بھر غیب سے اس کے کان میں یہ آواز آئی کہ اِنَّکَ مِنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ (تو اہل جنت میں سے ہے) یا یہ آواز آتی رہے کہ: اِنَّکَ مِنْ اَھْلِ النَّار (تو دوزخیوں میں سے ہے) تو کسی بھی وقت عمل میں ذرہ برابر بھی کمی نہ کرے۔ بدستور کام میں لگا رہے۔ نہ پہلی

(۱) ''اس دروازے سے مایوس تو اس صورت میں ہونگا جبکہ مجھے کوئی دوسرا در نظر آئے پھر جب دوسرا در ہو تو اس در سے محروم ہونے کا غم نہیں لیکن میں نے سنا ہے کہ اس کے کوچہ کے علاوہ کوئی راہ ہی نہیں ہے اس کے دروازے کے علاوہ کوئی در نہیں ہے، قبول کریں تو ان کی مہربانی نہ قبول کریں تو ان کی مرضی'' (۲) ''جاؤ قبول کرلیا کیونکہ ہمارے سوا تمہاری کہیں پناہ نہیں ہے''۔

آواز سے بے فکر ہو نہ دوسری آواز سے دلبرداشتہ ہو۔ اسی کو فرماتے ہیں: وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ(۱)

یہی ہے اسلام وجہ اور یہی ہے بذلِ نفس۔ ہاں احسان شرط ہے، جس کی تفسیر حدیث میں یہ آئی ہے۔ ”ان تعبد اللّٰه كانك تراه فأن لم تكن تراه فانه يراك“(۲)

طلب رضاء

میں اس کی شرح بھی کیئے دیتا ہوں۔ کیونکہ بہت لوگ اس میں غلطی کرتے ہیں مشہور تو یہ ہے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ نے عبادت کا طریقہ دو مراقبوں سے بتلایا ہے کہ اول تو یہ تصور کرو کہ ہم خدا کو دیکھ رہے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوسکے تو یہی تصور کرو کہ خدا تعالیٰ ہم کو دیکھ رہے ہیں۔ مگر ان مراقبات سے حدیث کو کوئی علاقہ نہیں۔ بلکہ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ عبادت ایسی اچھی طرح کرو جیسی خدا تعالیٰ کو دیکھ کر کرتے آگے فاء تعلیلیہ ہے جس میں پہلے کلام کی علت مذکور ہے کہ تم کو عبادت ایسی ہی کرنی چاہئے کیونکہ اگر تم خدا تعالیٰ کو اس وقت نہیں دیکھتے تو اس کا تو یقین ہے کہ وہ دیکھ رہے ہیں اور اُن کے دیکھنے کا بھی وہی مقتضاء ہے جو تمہارے دیکھنے کا مقتضاء ہے کیونکہ ایک مزدور کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس وقت حاکم میرے کام کو دیکھ رہا ہے گو اُس کو نظر نہ آتا ہو(۳) تو یہ علم بھی اُس کے حسن عمل کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ یہ تفسیر لُغت کے بھی موافق ہے کیونکہ لغت میں احسان کے معنی نکو کردن ہیں(۴) اور شریعت نے اپنی اصطلاحات میں لغت کا بہت

(۱) ”جو کوئی شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو تو ایسے شخص کو اس کا عوض ملتا ہے اپنے پروردگار کے پاس پہنچ کر“ (۲) ”تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کر جس طرح تو اللہ تعالیٰ کو دیکھتا تو عبادت کرتا کیونکہ تو اگر اسے نہیں دیکھ رہا مگر وہ تجھے یقیناً دیکھ رہا ہے“ سنن الکبری للنسائی: ۱۱۷۲۱ (۳) آج کل اس کی مثال دفاتر میں کیمروں کا نصب ہونا ہے کہ مالک مزدور کے کام کو دیکھ رہا ہوتا ہے، مزدور اس کو نہیں دیکھتا (۴) عمدگی سے کام سرانجام دینا ہے۔

لحاظ کیا ہے صرف اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ معنی لغوی عام تھے۔ شریعت نے اس کو کسی قید کے ساتھ مقید کر دیا ہے۔ سو اس تفسیر پر معنی شرعی کو لغت سے زیادہ بعد نہیں ہے لغت میں احسان نکو کردن ہے اور شریعت میں نکو کردن عبادت (۱) ہے اور تفسیر مشہور پر جب کہ احسان کی تفسیر مراقبات سے کی جائے گی لغت میں بہت بعد ہو جائے گا۔ میں اس حدیث کا مطلب بحمد للہ اول تو خود بھی یہی سمجھا تھا جو اوپر بیان کیا گیا ہے پھر کتابوں میں دیکھا تو غالباً علی قاری اور نووی نے بھی یہی لکھا ہے اور اخیر میں مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر دیکھی تو حضرت نے بھی یہی لکھا ہے۔ اس سے میرا بڑا جی خوش ہوا۔ پھر میں نے کسی مقام پر غالباً تکشف میں حضرت گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ ہی کی طرف منسوب کر کے یہ تقریر لکھ دی ہے کہ حضرت نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کیونکہ بڑوں کی بات لوگ جلدی مان لیتے ہیں۔ ہماری کون سنتا ہے۔

طلب مطلوب سے وصول مطلوب نہیں

یہ تو ''من یشری نفسه'' کی تفسیر تھی آگے فرماتے ہیں ''ابتغاء مرضاة اللّٰه'' (اللہ کی رضا کی خاطر) ایک مسئلہ اس سے مستنبط ہوتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے یہاں ''من یشری نفسه لارضاء'' نہیں فرمایا۔ بلکہ ''ابتغاء مرضاة اللّٰه'' (اللہ کی رضا کی خاطر) فرمایا ہے تو لفظ ''ابتغاء'' کے بڑھانے سے ایک مسئلہ پر تنبیہ ہوئی کہ مقصود طلب رضاء ہے حصول رضاء مامور بہ نہیں۔ یہ علوم صوفیہ کی صحبت میں رہنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ علماء یہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ میں نے بچپن میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک جملہ سنا تھا۔ اس وقت تو اُس کی حقیقت منکشف نہ ہوئی تھی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ واقعی علم عظیم ہے۔ بچپن میں میرا

(۱) عبادت کو اچھی طرح سرانجام دینا ہے۔

حافظہ بہت اچھا تھا۔ اُس وقت کی باتیں بہت محفوظ ہیں۔ اب خراب ہو گیا ہے۔ اب تو چار دن کی بات بھی یاد نہیں رہتی۔ مگر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ پھر بچپن کی باتیں اس وقت کیونکر یاد ہیں، بات یہ ہے کہ اس وقت یُبس کا غلبہ ہے (۱) اور پتھر کی خاصیت ہے کہ اُس میں نئی لکیر تو مشکل سے پڑتی ہے لیکن جو لکیریں پہلے سے پڑی ہوئی ہوتی ہیں وہ نہیں مٹتیں۔ تو مولانا نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ طلب مطلوب ہے وصول مطلوب نہیں۔ کیونکہ طلب تو اختیاری ہے اور وصول غیر اختیاری ہے اور بندہ اختیارات کا مکلّف ہے نہ کہ غیر اختیاری امور کا۔ اس سے بڑی مشکلات حل ہو گئیں۔ کیونکہ طالب اگر کسی وقت شاکی ہو تو اُس سے کہنا چاہئے کہ تم کو طلب بھی ہے یا نہیں ہے تو پھر ثمرہ کا انتظار کیسا۔ اول طلب تو پیدا کرو۔ اور اگر کہے مجھے طلب تو ہے تو اُس سے کہنا چاہئے کہ بس مدعا حاصل ہے تم طلب ہی کے مکلّف ہو۔ تمہارا اتنا ہی کام ہے۔ وصول کے تم مکلّف نہیں ہو۔ نہ وہ تمہارا کام ہے بلکہ وہ خدا کا کام ہے۔ اُن کو اختیار ہے تم اپنے کام میں لگو۔ خدا تعالیٰ کے کام میں دخل نہ دو۔

کارِ خود کن کارِ بیگانہ مکن (۲)

آبِ محبت

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ اس مضمون کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان فرماتے ہیں:

آب کم جو تشنگی آور بدست　　تا بجوشد آبت از بالا و پست (۳)

یعنی پانی کی تلاش میں نہ لگو بلکہ اپنے اندر پیاس پیدا کرو پانی خود بخود آجائے گا۔ مگر اس سے یہ پانی مراد نہیں جو آپ روزمرہ میں پیا کرتے ہیں کیونکہ یہ

(۱) خشکی کا (۲) ''اپنا کام کرو دوسرے کا کام نہ کرو'' (۳) ''کم پانی والی ندی سے پیاس بڑھتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بالا پست سے جوش میں آجاتی ہے''۔

تو پیاسے کے منہ میں از خود کبھی نہیں پہنچتا، چاہے پیاسا مرنے بھی لگے کوئی جمنا (۱) تھوڑا ہی ہے جو بہہ کر آجائے گی۔ نہ معلوم اس کا نام جمنا کس نے رکھ دیا۔ اس کو تو بہنا کہنا چاہئے (۲) کہ ہر سال کہیں سے کہیں بہہ کر نکل جاتی ہے اور گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیتی ہے۔ بہرحال وہ دوسرا پانی ہے جس کا کچھ پتہ آگے دیا ہے۔ کہ وہ پانی ایسا ہے کہ ؎

تشنگاں گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں (۳)

وہ پانی اپنے پیاسوں کی تلاش میں خود رہتا ہے مگر اب بھی پوری تفسیر نہیں ہوئی۔ آگے ذرا اور واضح کر کے فرماتے ہیں ؎

ہر کہ عاشق دیدیش معشوق داں کو بہ نسبت ہست ہم این وہم آن (۴)

اب صاف کہہ دیا کہ آب محبت (۵) مراد ہے جس کا قاعدہ یہ ہے کہ جو پیاسا ہوتا ہے۔ یعنی عاشق وہ محض عاشق ہی نہیں ہوتا بلکہ معشوق بھی ہوتا ہے۔ جیسا یہ محبوب کا طالب ہے محبوب بھی اس کا طالب ہے۔ یہ مطلب ہے آب ہم جوید بعالم تشنگاں کا ایک مقام پر اور زیادہ وضاحت کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

بانگ می آید کہ اے عاشق بیا جود محتاجِ گدایاں چوں گدا (۶)

یہاں مولانا بہت مغلوب ہو گئے ہیں۔ کہ جود کو محتاج گدا کہہ دیا۔ عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مضمون کو خوب ادب سے ادا کیا ہے۔ حالانکہ وہ مولانا سے زیادہ مغلوب ہیں۔ مگر اس مضمون کو بہت بچا کر بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

---

(۱) دریا کا نام ہے ہندوستان میں دو مشہور دریا ہیں گنگا اور جمنا (۲) اس لئے کہ جمنا کا مطلب تو نہ بہنا ہے جبکہ یہ دریا تو مسلسل بہہ رہا ہے (۳) ''اگر پیاسے دنیا میں پانی کو تلاش کرتے ہیں تو پانی بھی دنیا میں پیاسوں کو تلاش کرتا ہے'' (۴) ''جس عاشق کو دیکھو اس کو معشوق سمجھ اگرچہ نسبت دونوں طرف ہے'' (۵) محبت کا پانی جو محبت کی پیاس کو بجھائے (۶) ''آواز آتی ہے کہ سخاوت خود فقیروں کی محتاج ہے''۔

سایۂ معشوق گر افتاد بر عاشق چہ شد مابادمحتاج بودیم او بما مشتاق بود(۱)

سبحان اللہ! کیا پاکیزہ الفاظ ہیں کہ ہم تو اُن کے محتاج تھے اور وہ ہمارے مشتاق تھے۔ ان کو محتاج نہیں کہا۔ بہرحال دونوں کا حاصل یہ ہے کہ طالب مطلوب بھی ہوتا ہے لیکن ایک فرق بھی ہے کہ ؎

عشقِ معشوقاں نہاں ست دستیر عشقِ عاشق باد وصد طبل ونفیر(۲)

یعنی اُن کی محبت تو مستور ہے اور عاشق کی محبت نے عالم میں شور مچا رکھا ہے اور

لیک عشقِ عاشقاں تن زہ کند عشق معشوقاں خوش وفربہ کند(۳)

مطلب یہ ہے کہ عاشق کا عشق تو اُس میں موثر ہے جس سے یہ متاثر ہو کر لاغر و حقیر ہو(۴) جاتا ہے اور محبوب کا عشق اُس میں موثر نہیں۔ نہ وہ اس سے متاثر ہیں۔ مطلب تو ہے کہ جس کے ادا کرنے کے لئے مجازاً فربہ کند فرمادیا۔ اس میں اعتراض کی کوئی بات نہیں۔ مجاز واستعارات میں ایسے الفاظ معاف ہیں۔ باقی معنی سب موافق اصول ہیں۔ بہرحال ابتغاء کے لفظ نے اس جگہ یہ مسئلہ حل کردیا کہ طلب مطلوب ہے وصول مطلوب نہیں ہے۔

وعدۂ رضاء

رہا یہ سوال کہ گو وصول کی طلب نہ کی جائے مگر وہ حاصل بھی ہوگا یا نہیں اس کو دوسری نصوص نے حل کردیا ہے: ﴿ وَمَنْ اَرَادَالْاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَھَا سَعْیَھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْیُھُمْ مَّشْكُوْرًا ﴾(۵)

(۱) ’’معشوق کا سایہ عاشق پر پڑ گیا تو کیا ہوگیا ہم اس کے محتاج ہیں وہ ہمارا مشتاق ہے‘‘ (۲) ’’معشوق کا عشق پوشیدہ اور چھپا ہوا ہے عاشق کا عشق ظاہر وباہر ہے‘‘ (۳) ’’لیکن عاشقوں کا عشق انہیں دبلا کردیتا ہے اور معشوق کا عشق انہیں فربہ اور موٹا کردیتا ہے‘‘ (۴) کمزور ونحیف ہوجاتا ہے (۵) ’’جو شخص آخرت کے ثواب کی نیت رکھے گا اور اس کی پہلے جیسی سعی کرنا چاہیے ویسی ہی سعی بھی کرے گا بشرطیکہ وہ شخص مومن بھی ہو پس ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی‘‘ سورۃ الاسراء:۱۹۔

اس سے معلوم ہوا کہ طالب کو رضا ضرور حاصل ہوتی یہ دوسرا مسئلہ لفظ مرضاۃ سے حاصل ہوا کہ مفوض کو رضا طلب کرنا چاہئے۔ بعض لوگ ذات کے طالب بنتے ہیں۔ عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی لتاڑتے ہیں ؎

عنقا شکار کس نشود دام باز چین　　کاینجا ہمیشہ باد بدست ست دام را(۱)

عنقا سے مراد ذات ہے۔ یہ ان کی خاص اصطلاح ہے مطلب یہ ہے کہ ذات محبوب تو وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے(۲) جہاں تمہارا ادراک نہیں پہنچ سکتا۔ اور طلب ہوتی ہے معرفت سے اور ذات کی معرفت ہوا کرتی ہے ادراک سے، اور ادراک اسی وقت رہتا ہے جب تک افراد متحقق ہیں۔ اگر تمام جزئیات فنا ہوجائیں تو کلی طبعی بھی فنا ہوجاتی ہے تو یہ شخص نعوذ باللہ فنائے خلق کے وقت حق تعالیٰ کو فانی کہے گا۔ بلکہ اس نے تو ابھی فانی کہہ دیا کیونکہ مخلوق کے لئے فنا لازم ہے۔ یہ آپ نے وحدۃ الوجود کی گت بنائی۔ اسی لئے حاجی صاحب نے اسی توحید کا لقب حمر توحید رکھا یعنی چماروں کی سی توحید۔ کیونکہ یہ عقیدہ کفار کا ہے وہ مخلوق میں حلول واجب کے قائل ہیں سو خوب سمجھ لو کہ یہ مثالیں حقیقت پر محمول نہیں ہیں۔ ذات واجب کے لئے کوئی مثال نہیں ہوسکتی۔

"لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ" (اسکی مثل کوئی چیز نہیں) پس سالکین کو معرفت ذات اور طلب ذات کی ہوس نہ کرنا چاہئے۔ محض رضا طلب کرنا چاہئے یہ مسئلہ لفظ "مرضاۃ" سے مستنبط ہوا۔

ثمرۂ تفویض

آگے ثمرہ کا ذکر ہے وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ۔ میں نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ

(۱) "عنقا کسی کے شکار میں نہیں آتا اس لئے اپنا جال اٹھالے کیونکہ یہاں ہر شخص کا جال خالی گیا صرف ہوا ہاتھ آئی" (۲) اللہ تعالیٰ کی ذات کا ادراک نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ انسان کی عقل سے بہت اوپر کی بات ہے جہاں تک انسان کی عقل وفہم کی رسائی ہی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ایسے بندوں (جو اس طرح اپنے کو تفویض کردیتے ہیں) پر شفقت وعنایت فرماتے ہیں۔ میں نے ’’اَلْعِبَادُ ‘‘میں لام عہد کا لیا ہے۔اور یہ تفسیر بالرائے نہیں۔ کیونکہ قواعد عربیہ کے موافق ہے اور جو تفسیر قواعد پر منطبق ہو اور اُس میں کلماتِ قرآنیہ کا ربط زیادہ واضح ہوتا ہے۔ اس کے اختیار کرنے کا مضائقہ نہیں گو منقول بھی نہ ہو اور ظاہر ہے کہ اس جگہ لامِ عہد لینے سے ’’اِنَّ اللّٰہَ رَؤُفٌ بِالْعِبَادِ‘‘ کا تعلق ماقبل سے اچھی طرح واضح ہوگیا۔ اس میں بھی مسئلہ مستنبط ہوا وہ یہ کہ وصول کا حاصل صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ اس شخص پر شفقت وعنایت فرماتے ہیں۔ یہ معنی نہیں کہ وہ نعوذ باللہ حق تعالیٰ کی گود میں جا بیٹھتا ہے۔ یا قطرہ کی طرح دریا میں مل جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ تم بذل نفس کرو اور رضا کے طالب بنو(۱) اس پر یہ ثمرہ مرتب ہوگا کہ حق تعالیٰ تم پر عنایت فرمائیں گے۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور اس وعظ کا نام ’’فناء النفوس فی رضاء القدوس‘‘ رکھتا ہوں۔لغت دیکھنے سے معلوم ہوا کہ رضاء بالقصر کے معنی مطلق خوشنودی کے ہیں اور رضاء بالمد، باب مفاعلت کا مصدر ہے جس کے معنی طرفین کی خوشنودی کے ہیں چونکہ بذل نفس میں سالک کی طرف سے بھی رضاء بالحق ہوتی ہے اور اس پر رضا حق تعالیٰ کی بھی مرتب ہوئی ہے۔ اس لئے یہاں رضاء بالمد ہی مناسب ہے اور اُس میں قافیہ فناء کی بھی رعایت ہے۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو یہ دولتیں عطا فرمائیں۔ (آمین)

وصلی اللّٰہ علی سیدنا و مولانا محمد وعلی اٰلہ واصحابہ اجمعین واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین۔

---

(۱) تم جان لڑا کر محنت کرو اور رضاء الٰہی کے طالب رہو۔

خلیل احمد تھانوی